علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم

طلوعِ اسلام

جنوری -- فروری ۳۸

Rs. 18

Tolu-e-Islam Magazine
January & February 1948
Fehrist

دعا	page 2
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است	page 4
یاد میں!	page 6
انسانیت کی موت	page 7
شعائر	page 8
امید	page 9
غم مخور	page 10
فتمنوا الموت ان کنتم صادقین	page 11
سرحد کے غیور مجاہدین کے نام	page 12
سر خیل غداران!	page 13
یہ ٹھیک ہے کہ	page 14
لیکن ـــ کیا آپ چاہتے ہیں کہ	page 15
حکام سے!	page 16
پاکستان مجلس آئین ساز کے ارکان سے	page 18
آئین پاکستان	page 19
اصولی اختلاف	page 20
پس منظر	page 21
جون سنہ ۱۹۴۲ء کے بعد	page 65
پس چہ باید کرد!	page 96
قرآنی تعلیم	page 121
حقائق و عبر	page 131
ترانۂ پاکستان	page 150

دُعا

یا رب درون سینه دل باخبر بده
در باده نشه را نگرم آن نظر بده

این بنده را که با نفس دیگران نزیست
یک آه خانه زاد مثال سحر بده

سیلم مرا بجوی تنک مایه مپیچ
جولانگهی بوادی و کوه و کمر بده

سازی اگر حریف یم بیکران مرا
با اضطراب موج سکون گهر بده

شاهین من بصید پلنگان گذاشتی
همت بلند و چنگل ازین تیزتر بده

رفتم که طائران حرم را کنم شکار
تیری که نافگنده فتد کارگر بده

خاکم به نور نغمهٔ داؤد برفروز
هر ذرهٔ مرا پر و بال شرر بده

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و زِ سر تازہ کنیم

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب　　لالہ رست از ریگِ صحرائے عرب

او دلے در پیکرِ آدم نہاد　　او نقاب از طلعتِ آدم کشاد

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد　　مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

ہر خداوندِ کہن را او شکست　　ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست

حریت پروردۂ آغوشِ اوست　　یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست

عقل را او صاحبِ اسرار کرد　　عشق را او تیغِ جوہر دار کرد

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد　　ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

دینِ او، آئینِ او تفسیرِ کل　　در جبینِ او خطِ تقدیرِ کل

کاروانِ شوق را او منزل است
ما ہمہ یک مشتِ خاکیم او دل است

(رموز بیخودی)

طلوعِ اسلام

(دورِ جدید)

کا پہلا پرچہ آپ کے پیش نظر ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ رسالہ آپ تک برابر پہنچتا رہے تو زرِ چندہ ختم فروری سے پہلے پہلے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ اس لئے کہ آئندہ رسالہ صرف مانگ کے مطابق ہی شائع ہوا کرے گا۔

۲۔ سفید کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے یہ پرچہ "نیوز پرنٹ" پر چھاپا جا رہا ہے جس وقت سفید کاغذ دستیاب ہو گیا۔ رسالہ حسبِ معمول اسی پر چھپا کرے گا۔

۳۔ طلوعِ اسلام کی ضخامت عام طور پر ۴۸ و ۶۴ صفحات کے درمیان ہوا کرے گی۔ پہلا پرچہ جنوری فروری سنہ ۱۹۴۸ء کا مشترکہ نمبر ہے اس لئے ضخامت زیادہ ہے۔

۴۔ طلوعِ اسلام بالعموم ہر ماہ کی یکم کو شائع ہوا کرے گا۔

۵۔ سفلی اور بازاری قسم کے اشتہارات شائع نہیں کئے جائیں گے۔

۶۔ چندہ سالانہ دس روپے اور ششماہی چھ روپے ہے۔ عام پرچہ کی قیمت ایک روپیہ ہوا کرے گی۔ اس مشترکہ نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں ملے گا۔

۷۔ آج کل ڈاک کے انتظامات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ پرچہ یقینی طور پر آپ تک پہنچ جایا کرے تو بہتر ہو کہ تین آنے فی ماہ کے حساب سے رجسٹری کا خرچ بھی زرِ چندہ کے ساتھ ہی بھیج دیں۔

۸۔ منی آرڈر کے کوپن پر اپنا مکمل پتہ لکھئے ورنہ غلطی کا امکان ہے۔

۹۔ پرچہ وی۔پی نہیں بھیجا جائے گا۔ زرِ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے۔

زرِ چندہ اور خط و کتابت کا پتہ:- (عارف بٹالوی)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۳/۱ فاؤلرز لائن نیپئر بارکس کراچی ۳

پتہ کہیں نوٹ کر لیجئے۔ زبانی یاد نہیں رہے گا۔

یاد میں!

اُن لاکھوں بے گناہ، مظلوم انسانوں کی، جو بہار، گڑھ مکتیسر، دہلی، پنجاب، اجمیر، بھرت پور، الور، پٹیالہ، کپورتھلہ اور ایسے ہی ان گنت مقامات پر انسان نما درندوں کی ہوس خون آشامی اور بہیمیت و بربریت کے بیچ ترین کا اس سفاکی اور بیدردی سے شکار ہوئے جس کی نظیر چشم فلک نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھی تھی

اُن خانماں خراب، سوختہ بخت، تباہ حال، ستم زدہ، شکست خوردہ، ستم رسیدہ، بے سروسامان، قافلوں کی جن کی تمام متاع حیات اور ثمرات کائنات لٹ گئی اور جو زندگی کا بوجھ اپنی نحیف و زار پیٹھ پر لاد کر کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں، مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن جنہیں سردی سے بچنے کے لئے الاؤ اور سر چھپانے کیلئے پھوس کا چھپر تک نصیب نہیں۔

اُن عفت مآب خواتین کی جن کی ردائیں، چادر اور تاروں کے سوا کبھی کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑی تھی لیکن جنہیں عریاں بدن سربازار اس طرح پھرایا گیا کہ اس پر انسانیت رو دی اور حیا ماتم کرتی تھی۔

اُن معصوم بچیوں کی جو قوم کی عزت و ناموس کی سرمایہ دار تھیں لیکن جنہیں انسانی بھیڑیوں میں بھوکے بہائم درندوں کی طرح اچک کر لے گئے کہ ان کا آج تک سراغ نہ مل سکا

اُن پیکر مظلومیت ماؤں کی جن کے سامنے ان کے جگر گوشوں کو کرپانوں کی نوک پر اچھالا گیا لیکن جنہیں اس قیامت خیز سانحہ کو ہوش و حواس سے دیکھ کر آہ تک بھی بھرنے کی اجازت نہ دی گئی۔

اُن خاموش نگاہوں کی جنہوں نے زندگی کی تمام بہاروں کو لٹتے اور امیدوں کے سب آسروں کو ٹوٹتے دیکھا لیکن جن کے متاع آنسوؤں کو سرخ گال تک پہنچ کر آجانے کے بعد بھی اذن چھلکنے نہ ملا۔

ہاں! یاد میں مصائب و آلام کی ان تمام قیامتوں کی جنہیں فرزندان توحید پر اس جرم کی پاداش میں توڑا گیا کہ انہوں نے اپنا رشتۂ ایمان، دامن محمد عربی سے کیوں وابستہ کر رکھا ہے؟

لیکن

یہ وہ لوگ یہود کے مذہب نہیں جس کا مقصد مٹانا ہمہ تن ماتم گساری اور نوحہ خوانی میں گزار دینا ہوتا ہے۔ یہ یاد ہم اس حقیقت کبریٰ کو سامنے رکھنے کے لئے ہے کہ

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۚ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

اگر تمہیں ان [illegible] میں زخم لگا ہے تو گھبراؤ نہیں [illegible] تمہارے حریف [illegible] یہ تو زمانے کی گردش [illegible]

لہٰذا! وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)

ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو [illegible] اگر تم مومن ہو تو سب سے بڑی بلندی تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے [illegible]

مسلم ہستی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زمان پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

انسانیت کی موت

دسمبر کا مہینہ ہے لاہور کے کڑکڑاتے جاڑوں کی کپکپاتی رات۔ کانپتی ہوئی فضا نے اپنے آپ کو کہرے کے لحاف میں لپیٹ رکھا ہے۔ میٹ بلاک کے سامنے لشا منزل کے روشندانوں سے بجلی کی روشنی، درختوں کے مرجھائے ہوئے پتوں سے چھن چھن کر باہر آرہی ہے۔ بائیں جانب، کھڑکی کا شیشہ ایک کمرہ کے مشمولات کی غمازی کر رہا ہے۔ فرش پر بیش بہا ایرانی قالین، دیوار پر قد آدم آئینہ، سامنے آتشدان میں دہکتے ہوئے کوئلے شعلوں کی لپک سے بجاتے ہوئے۔ ایک طرف، ایک پلنگ، گدے پر، نرم و گرم کمبلوں میں لپٹا ہوا ایک بڑا سا شخص۔ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا (غیر ملکی ڈاکٹر) سامنے تپائی پر دوائیوں کی شیشیاں۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "نمونیہ کے اثرات تو اب نہیں ہیں۔ لیکن آج رات غیر معمولی سردی ہے۔ اس لئے خاص احتیاط کی ضرورت۔ بہتر ہو کہ اس پر ایک کمبل اور ڈال دیا جائے اور انگیٹھی میں آگ مدھم نہ ہونے دی جائے۔"

پاس کھڑے ملازمین نے فوراً ہدایات پر عمل کیا۔ اور رات بھر کے لئے ان کی ڈیوٹیاں لگ گئیں۔ علی الصبح ڈاکٹر نے کتے کا پھر معائنہ کیا! اور اس کے آقا کو اطمینان دلایا کہ اب خیریت ہے۔ آقا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کتے کی طرف دیکھ کر مسرت کی ہنسی ہنسا۔ ڈاکٹر نے باہر نکلنے کے لئے دروازہ کھولا تو سڑک سے اخبار بیچنے والے لڑکے کی تھرتھراتی ہوئی آواز، یخ بستہ فضا کو چیر کر اندر آگئی۔

آج کا تازہ پرچہ۔ رات مہاجرین کے کیمپ میں چار سو آدمی سردی سے مر گئے

(زمان ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء)

پاکستان کے مسلمانو! ترس کھاؤ اپنے آپ پر! رحم کرو اپنی اولاد پر! کیوں خدا کے غضب کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھلاتے ہو؟ کیا ابھی کچھ اور کسر باقی ہے؟ یہ چار سو انسانوں کی موت نہیں، یہ موت بھی تمہاری انسانیت کی۔ اور قسم ہے خدائے قدوس کے اس قانون ابدی کی جو امتوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ قومیں انسانوں کے مرنے سے نہیں مرا کرتیں۔ وہ مرا کرتی ہیں انسانیت کی موت سے۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْدٌ

شعائر

جب تمازتِ آفتاب اپنی انتہائی شدت پر پہنچ جاتی ہے۔ بادِ سموم کے تند مزاج جھونکے ہر ذی روح کو جھلس کر رکھ دیتے ہیں۔ فضا میں برودت و رطوبت کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ زمین پر شگفتگی و بشاشت کا سراغ تک نہیں رہتا۔ سوختہ بخت کسان کی نگہِ امید چاروں طرف سے ناکام و نامراد ہو کر کاشانۂ جہنم میں لوٹ آتی ہے۔ دنیا آنے والی خشک سالی کے تصور سے کانپ اٹھتی ہے۔ اس کی امیدوں کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ آرزوئیں سب پامال ہو جاتی ہیں۔ یاس و ناامیدی کشتِ مراد کے ہر گوشے پر مسلط ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت ـــ ہاں عین اسی وقت ـــ افق سے اس پار، ایک چھوٹی سی بدلی، درخشندہ امیدوں کی جھلکیاں اپنے جلو میں لئے، اٹھتی ہے اور اپنی گھنگھور بدلیوں اور مینہ افشانیوں سے ہر سوختہ سامان کے دامنِ تہی کو امیدوں سے بھرپور کرتی ہوئی ہنستی ہوئی آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰/۵۰)

دیکھ اللہ کی رحمتوں کے آثار و شواہد پر غور کرو۔ وہ کس طرح زمینِ مردہ کو پھر سے زندگی کی بہاروں سے نوازتا ہے۔

یہ اس کا قانون ہے جس کے قانون میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں۔ یہ اس کا آئین ہے جس کے آئین میں کہیں کوئی کوتاہی نہیں۔ پھر جس طرح یہ قانون طبیعی اور مادی دنیا میں جاری و ساری ہے، اسی طرح یہ آئینِ سرمدی انسانوں کی بستیوں پر بھی حاوی و طاری ہے۔ لہٰذا اگر آج پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سر پر مصائب و نوائب اور آلام و شدائد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، اگر انہیں بظاہر امید کا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ اگر ان کے تمام سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں۔ تو ان کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ہمت ہارنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے زندہ خدا کا وہی پائندہ قانون آج بھی موجود ہے اور ان سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)

اور اللہ ہرگز کفار کو مومنین پر غلبہ نہیں آنے دے گا۔

لہٰذا اگر کفار کے ہاتھوں تمہیں آج تکلیفیں پہنچ رہی ہیں تو، یہ سمجھ کہ تم میں ایمان کی کمزوری آ چلی تھی۔ ان کی یہ بالادستی مستقل نہیں رہ سکتی۔

اٹھو! ہمت کرو، اپنے عزائم میں بلندی، ارادوں میں استقامت، ایمان میں پختگی اور عمل میں درستی پیدا کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کے یہ وعدے کس طرح پورے ہوتے ہیں کہ

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۳۳/۲۷)

تمہیں تمہارے دشمنوں کی زمینوں کا، ان کے گھروں کا اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا، اور ان زمینوں کا بھی جو تمہارے قبضے میں تھیں بلکہ ان زمینوں کا بھی جن تک ابھی تمہارا عمل دخل نہیں پہنچا تھا۔ وہ سب تمہیں ملا ہوا تو شامل

امید

نظر آتا ہے لیکن ، اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔

یہ محض موہوم امیدوں کی خیالی جنت نہیں حقیقت ہے ، اور ایک ایسی حقیقت جسے خدا نے مقدر کر دیا ہے

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ...... اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۲-۲۰)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے ، اس لئے کہ اللہ قوی ، غالب ہے ، تو ان لوگوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں کبھی ایسا نہ پائے گا کہ وہ کسی ایسے شخص سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول (یعنی نظام حکومت خداوندی) کی مخالفت کرے ، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ، ان کے بھائی بہن یا ان کے گھرانے کے دیگر افراد۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ وہ اپنی روح سے ان کی مدد کرے گا اور انہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں تاکہ ان کی شادابی و سرسبزی میں کبھی فرق نہ آنے پائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ اپنے اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی اللہ کا گروہ ہے اور دیکھو کامیابی و کامرانی سب اسی گروہ کیلئے مقدر ہے۔

یہ خدا کی طرف سے لکھا جا چکا ہے ، یہ تمہارے لئے مقدر ہو چکا ہے ۔ اس نوشتۂ تقدیر الٰہی کو دنیا کی کوئی قوت نہیں مٹا سکتی۔ پس تم نے فقط اتنا کرنا ہے کہ اللہ کے گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ تمہاری ناکامیاں کس طرح کامیابیوں میں ، ذلتیں عزتوں میں ، ناامیدیاں امیدوں میں ، نگوں ساریاں سرفرازیوں میں ، شکست فتح میں اور موت ، زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے ، اور اللہ کا وعدہ اٹل ہوتا ہے

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے　　اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود ، اس کا افق بے ثغور　　اس کے سمندر کی موج ، دجلہ و دنیوب و نیل

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

غم مخور

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر اسلامیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام، دنیا کی امامت کا

(اقبالؒ)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ

اگر تم اپنے دعوی ایمان میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!

بہار میں زلزلہ آیا اور ایک لاکھ کے قریب انسان زمین کے نیچے دب کر مر گئے

بنگال میں قحط پڑا تو دس لاکھ انسان فاقوں کی نذر ہو گئے۔

ستلج اور راوی میں سیلاب آیا تو ہزارہا انسان پانی میں بہ گئے۔

مشرقی پنجاب میں قیامت ٹوٹی تو چھ لاکھ کے قریب مسلمان درندوں کا شکار ہوئے۔

اور کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر منٹ پر ایک آدمی ریل اور موٹر کے حادثوں میں مر جاتا ہے۔

موت کتنی عام ہے اور کس طرح انسانوں کو اپنے سیلاب میں بہائے لیجا رہی ہے

لیکن

فنا کر دینے والی موت وہی ہے جس سے انسان بھاگنا چاہتا ہے۔

جب انسان خود موت کی طرف لپکتا ہے تو موت اس سے بھاگ اٹھتی ہے۔

اور پھر اسے وہ حیات ابدی نصیب ہوتی ہے جس تک موت کی کبھی رسائی نہیں ہوتی۔

آج یہ حیات ابدی ملتی ہے کشمیر کے لالہ زاروں میں۔

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را

(دسمبر ۱۹۴۸ء)

سرحد کے غیور مجاہدین کے نام

غزوۂ احد میں کیفیت یہ ہو گئی کہ جیشِ اسلامی کے ایک گروہ کی ذرا سی غلطی سے فتح شکست میں بدل گئی۔ مجاہدین کی صفوں میں انتشار واقع ہو گیا۔ جمے ہوئے قدم اکھڑ گئے، میدانِ جنگ میں بھاگڑ مچ گئی۔ دشمن موقع کو غنیمت سمجھ کر سیلابِ بے پناہ کی طرح امنڈ پڑے۔ چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ میدان میں افراتفری مچ گئی۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کوئی ایک دوسرے کی بات نہیں سنتا تھا۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں ایک پکارنے والے نے پکارا۔ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ! اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ۔ اے خدا کے بندو! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ میں اس کا رسول یہ اپنے مقام پر کھڑا ہوں۔ آؤ۔ میری طرف آؤ۔ میدان چھوڑ کر مت بھاگو۔ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے۔

نہ معلوم اس آواز میں کیا اعجاز تھا کہ جس کے کان میں پڑی، سیدھی دل تک اتر گئی۔ بھاگنے والے قدم رک گئے۔ جس تیزی سے میدان چھوڑ کر نکل رہے تھے اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے واپس لوٹے اور اس آواز دینے والے کے گرد جمع ہو گئے۔ ٹوٹی ہوئی جمعیتیں منظم ہو گئیں۔ اکھڑے ہوئے قدم تھم گئے ہوئے حوصلے لوٹ آئے۔ پھر ایک بار ایک مرکز پر اکٹھے ہوئے اور اس زور سے پلٹا کھایا کہ ان کے سامنے دشمن کی صفیں پرِ کاہ کی طرح اڑ گئیں۔

***

قوموں کی زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے جب ان کی جمعیت و جیش منتشر ہو جاتی ہیں۔ ان کے حوصلے افسردہ اور ان کے عزائم پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا کوئی نورِ ہدایت باقی نہیں رہتا۔ ان میں بری طرح بھاگڑ مچ جاتی ہے۔ ایسے میں اگر انہیں کوئی پیچھے سے پکارنے والا مل جائے تو ان کی موت، زندگی سے اور ان کی شکست فتح سے بدل جاتی ہے۔

مشرقی پنجاب کے حوادث و مصائب سے مسلمانانِ پاکستان کی ایسی ہی حالت ہو چلی تھی۔ ان کی ہمتیں بری طرح سے افسردہ اور ان کے حوصلے انتہائی طور پر پست ہو چکے تھے۔ ہجومِ ناامیدی سے زندگی کی کوئی نورانی کرن ان کے سامنے باقی نہ رہی تھی۔ دنیا ان کے نزدیک اندھیر ہو چلی تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے کے لئے اور جی رہے ہیں تو کس مقصد کی خاطر۔ وہ اپنی لاشوں کے آپ جنازہ بردار، طوعاً و کرہاً زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ انہیں کوئی پیچھے سے آواز دینے والا ہوتا۔ لیکن ان میں ایسا کوئی نہ تھا۔

سرحد کے جانباز سپاہیو! تم نے اپنے رسول کی اتباع میں ان ڈوبنے والوں کو پکارا اور کشمیر کی گل پوش وادیوں سے ایک ایسی نوید کامرانی، نوید شادمانی ان کے لئے فردوسِ گوش بنائی، جس نے ان کی زندگی کی شاخِ خزاں دیدہ کو پھر سے بہار بنا دیا۔ ان کی حیات، بے مدعا نے پھر سے ایک مدعا پا لیا۔ انہیں زندگی کا پھر سے ایک آسرا مل گیا۔ ان کی ناامیدیاں امیدوں میں اور ان کی پژمردگیاں شگفتگیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ و کان ذالک علی اللّٰہ عزیزا بعید معلوم ہوتا۔

سرحد کے غیور مجاہدو! تم نے ملتِ اسلامیہ کی لاج رکھ لی۔ تم نے اسلام کی ڈوبتی ہوئی نبض بچا لی۔ تم نے جس بھی سرا کو خاک کرنے کے قابل بنا دیا۔ نہ صرف یہ کہ تمہارا سر اونچا ہے اور تمہیں اپنی چوکھٹ کے سوا اور کسی کے آستانے پر جھکنا پڑے۔ تم نے اپنی ضربِ کاری سے اس بھلائی ہوئی حقیقت کو پھر سے ہمارے سامنے اجاگر کر دیا کہ

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی　　یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

سرخیلِ غدّاران!

انسان بھی عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔

اس کی رفعتوں کی طرف نگاہ اٹھائیے تو آسمان کے فرشتے اس کے حضور سجدہ ریز نظر آئیں گے۔ اور اس کی پستیوں کو دیکھئے تو شیاطین الخبیث بھی اس سے پناہ مانگتے دکھائی دیں گے۔

اس کے ایمان کے مظاہروں کو سامنے لائیے تو وہ دہکتی ہوئی آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں تبسم کناں کود جائے گا، لیکن حق و صداقت پر ذرا سی آنچ نہ آنے دیگا اور اس کی منافقانہ کرتوتوں کو دیکھئے تو ایک ذرا سی ذاتی منفعت کی خاطر پوری کی پوری متاعِ دین و ملت بلا تامل و توقف بیچ ڈالے گا۔

آسمان کی آنکھ نے ان دشمنانِ انسانیت، غدارانِ ملت کے اس قسم کے بیع و شریٰ کے اکثر معاملات کو دیکھا۔ چاہِ کنعان کے کنارے، برادرانِ یوسف کو دیکھا۔ یروشلم کی پہاڑیوں پر یہودا اسکریوطی کو دیکھا۔ بغداد کے امور وزیر ابن علقمی کو دیکھا۔ دہلی کے قلعہ میں مشہور نمک حرام تو کچی کو دیکھا۔ کہیں سرزمینِ بنگال میں جعفر لعین کو دیکھا اور کہیں خطۂ دکن میں صادق لعین کو دیکھا۔ نگاہ یورپ کے کلیساؤں میں، کلید برداران کعبہ کو دیکھا۔ اور بالآخر ہندوستان کے جنگلوں میں کوئی؟ ترہت قبیلہ کو دیکھا۔

اس نے باری باری ان سب غداران ازلی کو دیکھا اور ان کی انسانیت سوز اور ایمان فروش تجارت کو ہر جگہ بھانپا لیکن جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے کشمیر کی وادیوں میں گزرا ہے اس کی مثل و نظیر اس نے شاید ہی کہیں کچھ اور دیکھا ہو۔ ایک کشتِ گندم پر فردوس سا ملت بیچنے والے انسان آدم تو اس کی آنکھوں نے پیشتر دیکھے تھے لیکن یہ مردودِ ازلی جو جنت دکھاتے ہوئے آواز لگا رہا کہ

میں اک جو پہ دونوں جہان بیچتا ہوں

نفس مست فروشاں بھی اپنی طرز کا پہلا سوداگر ہے جس کی نہ شرم و حیا کا کچھ پاس ہے نہ ننگ و ناموس کا کچھ لحاظ۔ جسے دکھی انسانوں کے بچوں کا نالہ کا کوئی غم ہے، نہ ملک کی نعش شدہ کائنات کی بے حیائی پر جو خون کے آنسو رو رہی ہے اور جس کی بے غیرتی پر انسانیت ماتم کر رہی ہے۔ وہ بے حس اور بے ضمیر ہے جس سے نہ خاک لمحانے اگر طرف کرنے کے لئے آمادہ ہے نہ آتشِ جہنم اپنے آپ کو ناپاک کرنے کے لئے تیار ہے نہ اس دنیا میں کوئی شریف انسان اپنے پاس پھٹکنے کی اجازت دے سکتا ہے نہ اس جہان میں اس کے لئے کوئی گوشۂ عافیت ہے۔

اے ہوائے تند! اے دریائے خوں | اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب! | اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!
اے بتانِ ابیض! اے مردانِ عرب! | اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب
ایں جیاں بے ابتدا بے انتہا است | بندۂ غدّار را مولا کجا است

(اقبال)

یہی ہے وہ عبد الطاغوت عبد اللہ صکوس جس شر الدواب کے متعلق قرآن میں ہے کہ ان المنافقین ...... ولن تجد لھم نصیرا۔ یقیناً یہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے۔ اور تو ان کا کوئی مددگار نہیں پائے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ

ہماری تباہی و بربادی، نکبت و زبوں حالی، ویرانی و خانماں خرابی، قتل و غارتگری اور دیگر جملہ مصائب و ابتلاؤں کی ذمہ داری ایک حد تک ہمارے ارباب حل و عقد کی ناعاقبت اندیشی اور غلط روی پر ہے۔

ہماری موجودہ کس مپرسی اور بیچارگی، مفلسی اور محتاجی، بے سروسامانی اور لاوارثی بڑی حد تک ہماری حکومت کی تغافل کیشی اور تساہل انگاری کی رہین منت ہے۔

ہماری پریشانیاں اور رسوائیاں، ایک گونہ ان کی بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کا نتیجہ ہیں

ہمیں کھانے کے لئے روٹی، پہننے کو کپڑا، اور رہنے کو مکان، اور دیگر ضروریات زندگی باسانی میسر آسکتی تھیں اگر انصرام متعلقہ میں بددیانتی، ارتشاء، نالائقی، ناتجربہ کار نہ ہوتے

ہماری مصیبتوں کا بوجھ بہت ہلکا ہوسکتا تھا اگر ان ارباب نظم و نسق میں ایسے لوگ نہ ہوتے جو مُردوں سے کفن تک اتار لینے میں کوئی باک نہ سمجھتے ہوں۔

ہماری بہت سی قیمتی جانیں جو صحیح و سالم پاکستان تک پہنچنے کے بعد بھوک اور سردی کی نذر ہوگئیں ضائع ہونے سے بچ سکتی تھیں اگر یہ جمود و تعطل کی برف کی سلیں جو ہمارے سروں پر مسلط ہوچکی ہیں، جذبات مہر و محبت کی گرمی سے پگھل جاتیں۔

ہمارے سینوں کے زخم اس طرح خوں فشاں نہ ہوتے اگر انہیں چارہ سازی و غمگساری کا مرہم نصیب ہوجاتا۔

ہماری آنکھوں کے آنسو اس طرح دجلہ بار و سحاب ریز نہ ہوتے اگر انہیں کوئی آستین غمخواری اور دامن ہمدردی میسر آجاتا

ہاں یہ ٹھیک ہے اور بالکل ٹھیک۔ یہ درست ہے اور صد فی صد درست کہ ہم آج اس قدر ذلیل، خوار اور زبوں حال و نامراد نہ ہوتے، اگر ہمارے وہ صاحبان عزت و ثروت اور ارباب دولت و سطوت کہ جنہیں کچھ معلوم نہیں کہ دکھ اور تکلیف کسے کہتے ہیں اور مصیبتوں اور پریشانیوں سے انسان پر کیا گذرتی ہے۔ لیکن جو آج ہمارے دکھوں اور تکلیفوں میں برابر کے شریک ہونے کے لفظی دعویدار ہیں، اگر ہمیں آستانوں کا افتادہ اور بھکاری نہ سمجھتے اور اس حقیقت کا احساس کرتے کہ ابھی کل ہی ہم ان سے بھی زیادہ عزت و حشمت کے مالک تھے۔ اور ہماری مصیبت صرف ہماری مصیبت نہیں۔ پوری کی پوری قوم کی مصیبت ہے۔ لہٰذا اس مصیبت میں سب کو عملاً شریک ہونا چاہیئے۔

[illegible] ۱۴ اور درست ہے [illegible]

لیکن ...... کیا آپ چاہتے ہیں کہ

یہ خطۂ زمین، جو ہمارے لئے اس وقت گوشۂ عافیت ہے اور جہاں پہنچ کر ہم ان وحشی درندوں کے چنگل سے محفوظ ہو گئے ہیں جن کے ہاتھوں نہ ہماری جانیں محفوظ تھیں نہ عزتیں، ہمارے ہاتھوں سے نکل کر دشمنوں کے ہاتھوں میں چلا جائے۔ ہم... ہندوؤں اور سکھوں کی غلامی میں چلے جائیں جنہیں نہ انسانیت کا پاس ہے نہ شرافت کا کوئی لحاظ، نہ دنیا کی کوئی شرم ہے نہ خدا کا خوف۔ جن کے ہاں نہ کوئی قانون ہے نہ آئین۔ جو عدل و انصاف کے نام سے بھی ناآشنا اور ایفائے عہد و احترام معاہدہ کے مفہوم تک سے بے خبر ہیں۔ اسلام سے نفرت جن کا شیوہ اور دین خداوندی سے عداوت جن کا مسلک ہے جن کے عزائم و مقاصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان، مسلمان کی حیثیت سے باقی نہ رہنے پائے۔ یہ ہیں وہ لیطفئوا نور اللہ کے جو مصداق اور لیغیظ بہم الکفار کے جو مرجع ہیں اور قرآن کی نصوص صریحہ کے مطابق تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن۔ کیا آپ ان کی غلامی چاہتے ہیں؟

اگر آپ یہ نہیں چاہتے!

اور چاہتے ہیں کہ آپ اور آپ کی آنے والی نسلیں مسلمانوں کی زندگی جئیں اور مسلمانوں کی موت مریں۔ اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی آپ کے نصیب ہو اور آخرت میں فلاح و سعادت آپ کے مقدر۔ ان زمینوں اور املاک کو پھر سے واپس لیں جو دشمنوں نے آپ سے چھین لی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان پر ایک دن پرچم توحید لہراتا ہوا نظر آئے۔

تو اسے بھول نہ جائیے کہ

یہ اسباب دولت و سطوت اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ صرف یہ یاد رکھیے کہ پاکستان کے خطۂ زمین کے تحفظ کیلئے آپ نے کیا کرنا ہے۔

اگر آپ نے اسے یاد رکھا تو

یہ سب طرح طرح کی ان دیکھی فریب اس انقلاب کے سیلاب میں بہہ جائیں گے جو آپ کے ہاتھوں سے وجود میں آئیگا اور ایمان؟ صرف وہی سرفرازی کی زندگی بسر کریگا جو شرف انسانیت کے جوہر سے بہرہ یاب ہوگا۔ اس کے لئے نہ ہی جماعت بن جائیے جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے۔

الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابہم القرح .... فلا تخافوہم وخافون

ان کنتم مومنین (۳: ۱۷۲-۱۷۵)

وہ لوگ کہ جنہیں شکست ہائے کے زخم لگ چکے تھے لیکن پھر بھی جب انہیں خدا اور رسول نے میدان میں آنے کیلئے آواز دی تو انہوں نے فوراً لبیک کہا۔ یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے حسن عمل اور تقویٰ کی راہ اختیار کی اور انہی کیلئے اجر عظیم ہے۔ وہ لوگ کہ جب ان سے کہا گیا کہ دشمنوں نے تمہارے خلاف بڑے بڑے لشکر جمع کر رکھے ہیں (ان سے ڈرو) تو ان کے ایمان میں اور بھی پختگی پیدا ہو گئی اور وہ پکار اٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ چنانچہ مقابلہ پر گئے تو اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے۔ کوئی برائی انہیں چھو بھی نہیں سکی اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔ یہ درحقیقت شیطان ہے جو تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔ ان سے مت ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو تو۔

حکام سے!

فرنگی نظام حکومت میں اس امر کا خاص طور پر اہتمام و التزام کیا جاتا تھا کہ حکام اور عوام میں خاصا بعد و فصل قائم رکھا جائے تا کہ حکومت کے اقبال کا رعب اور خوف ان کے دلوں میں جاگزیں رہے۔

خودداری اور عزت نفس ان کے ہاں سنگین جرائم کا حکم رکھتی تھی۔ اس لئے کہ اس قسم کے مردان خود نگاہ کی حق گوئی و بیباکی سے مصالح حکومت کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

نالائقی و نااہلی کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہوتی تھی کیونکہ اس قسم کے اہلکار اپنے بالا دست انگریز حکام کے دست نگر رہتے تھے اور ان کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتے تھے۔

فریب اور دغابازی، جھوٹ اور مکاری، رشوت ستانی اور حرام خوری، تملق اور خوشامد کو فروغ دیا جاتا تھا کہ اس سے طبقۂ حکام میں ضعف خودی پیدا ہوتا تھا اور عوام میں باہمی حسد و رقابت کے جذبات کی پرورش، جس سے غلامی کی زنجیریں پختہ سے پختہ تر ہو جاتی تھیں۔

انگریز چلا گیا۔ لیکن

اس کے نظام حکومت نے تمہارے قلب و دماغ کو جن سانچوں میں ڈھال دیا تھا، تم نے انہیں بدستور قائم رکھا ہے۔ بلکہ وہ برائیاں جو پہلے پھر بھی کسی حد تک، انگریز کے خوف یا شرم سے، دبی دبی سی رہتی تھیں، ابھر ابھر کر اوپر آگئی ہیں۔ خارجی دنیا میں پوری کی پوری بساط سیاست و حکومت بدل گئی۔ لیکن تمہارے قلب و نگاہ کی دنیا میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی — ہم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی

وہی اپنوں سے بیگانگی و مغائرت، وہی مصنوعی رعب و داب، وہی خوشامد پرستانہ مسلک، وہی فریب کارانہ مشرب، وہی حیلہ جوئی اور کام چوری، وہی نالائقی اور نااہلی، وہی خیانت و بددیانتی، وہی اقربا پروری و جنبہ داری، وہی ظلم و استبداد، وہی جور و ستم۔ کوئی دلخواہ نہیں جو تمہارے ہاتھوں نالاں نہ ہو۔ کوئی ستم رسیدہ نہیں جو تمہاری نازیبائی کا شکوہ سنج نہیں۔ ذرا سوچو!

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

یاد رکھو! اگر تم نے خود اپنے آپ کو نہ بدلا تو خدا کا نہ بدلنے والا قانون تمہیں بدل دے گا اور اس کا بدلنا ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تختہ الٹ جایا کرتا ہے۔

فلما جاء امرنا جعلنا عالیہا سافلہا (۱۱/۸۲)

پس جب ہمارا قانون مکافات عمل کے مطابق، ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے بالا دستوں کو زیر دست بنا کر رکھ دیا۔

عوام سے

گذشتہ تیس برس میں ہندوستان کی سیاست نے جس کی ہواؤں میں تم نے سانس لیا اور جس کی فضاؤں میں تم نے نشو و نما پائی، تمہیں قانون شکنی اور نافرمانی، سرکشی اور عناں تابی سکھائی۔ اور مسلسل پیہم یہ تعلیم دی کہ عدول حکمی میں رازِ حریت اور آئین فراموشی میں اصل آزادی ہے۔

تمہیں یہ بتایا گیا کہ جب بھی کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو، اس پر بگڑ جاؤ، شور مچاؤ، تقریریں کرو، جلوس نکالو، اور "انقلاب زندہ باد" کے کہکشاں گیر و ثریا بوس نعروں سے فضاؤں میں تہلکہ مچا دو۔ قانون اپنے ہاتھ میں لے لو، بس اسی میں تمہاری جیت ہے اور اس جیت کا نام آزادی ہے۔

رفتہ رفتہ تمہاری حالت یہ ہو گئی کہ آئین و ضوابط کی پابندی تمہارے لئے سامانِ موت اور حدود و قیود کی رعایت تمہارے لئے پیامِ مرگ بن گئی۔ نظم و ضبط کا مطالبہ تم پر سخت شاق، اور رسم و آئین کا تقاضا تم پر بے حد گراں گذرنے لگا، تمہاری طبیعت بے آئینی کی خوگر اور تمہارا مزاج بدنظمی کا عادی ہو گیا۔ نظم و آئین تمہارے نزدیک غیر فطری اطواق و سلاسل اور قوانین و ضوابط تمہاری نگاہ میں قید و بند کے اغلال و آہنی بن گئے۔

وہ زمانہ چلا گیا

وہ حکومت ختم ہو گئی جس کے خلاف تمہیں قانون شکنی اور عدول حکمی کے لئے بھڑکایا جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ تمہاری اپنی حکومت آگئی۔ لیکن تم نے اسی قانون شکنی اور ضابطہ فراموشی کی روش کو اصل حیات اور حکم عدولی اور نافرمانی کے مسلک کو عین آزادی سمجھ رکھا ہے۔ اور اب تک تمہاری یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور تم نعل در آتش ہو گئے۔ ذرا سوچو! کہ اس طرح دنیا میں کوئی نظم قائم اور کوئی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے۔

نظامِ کائنات، قانون و ضوابط کی پابندی سے قائم ہے۔ نظم و بزم آئین و دساتیر کے التزام سے چل رہا ہے۔

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

اگر قانون غلط ہے تو اسے صحیح قانون سے بدلنے کی کوشش کرو۔ لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئینی کا انتشار پیدا ہونے دو کہ اس انتشار سے دشمن، جو تمہاری گھات میں بیٹھا ہے، فائدہ اٹھا جائے گا اور تمہاری یہ حالت ہو جائے گی جیسے ایک نوزائیدہ چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر جائے۔

فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (۲۲/۳۱)

سو اسے چیل اور کوے (جس کا جی چاہے) اچک کر لے جائیں۔ یا آندھی کا جھکڑ اسے اس کے مسکن سے کہیں دور پھینک دے۔

پاکستان مجلس آئین ساز کے ارکان سے

پاکستان سردست ایک قطعۂ زمین ہے جس پر جس قسم کی عمارت ہم چاہیں تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس عمارت کا نقشہ مرتب کرنے اور سنگِ بنیاد رکھنے کا کام آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔

لہٰذا سوچئے کہ کس قدر اہم ہے آپ کا فریضہ اور کتنی عظیم القدر ہے آپ کی ذمہ داری! اس نقشہ کی ایک ٹیڑھی لکیر اور اس سنگِ بنیاد کا ذرا سا غلط رُخ، ساری کی ساری عمارت کو کجی سے بد نما دے گا۔ اس لئے غور کیجئے کہ آپ کو کس قدر حزم و احتیاط اور کس درجہ بصیرت، فراست سے کام لینا ہے۔ آپ میں ایسے بھی ہیں جن کے ذہن میں سوائے مغربی ایوانوں کے اور کسی عمارت کا نقشہ نہیں۔ اور ایسے بھی جن کی نگاہیں بار بار ہندوستان کے بتکدوں کی طرف اٹھتی ہیں۔

لیکن اسلام کا مطالبہ آپ سے کچھ اور ہے۔

وہ حریم پاکستان کی بنیادوں کو ان خطوط پر استوار کرنے کا تقاضا کرتا ہے جن کی ابتداء آج سے پانچ ہزار سال پیشتر، خطۂ حجاز کی بے برگ و گیاہ زمین پر ملت حنیفہ کے مؤسس اول حضرت خلیل اکبر کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جن کی تکمیل جناب محمد رسول اللہ کے دست مطہر سے سر انجام پائی۔ جو دنیا میں خدا کا پہلا گھر کہلایا، وہ ارتقائے شرفِ انسانیت کا بہترین گہوارہ اسلام ہی نمونے کی عمارت چاہتا ہے۔ جس کا مطالبہ تاسیس کا نہیں تجدید کا ہے۔ وہ آپ سے کوئی نیا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کرانا چاہتا۔ وہ صرف اس ضابطۂ خداوندی کی تنفیذ چاہتا ہے جو مسلمان کے لئے قیامت تک ایک مکمل آئینِ زندگی اور دستورِ حیات ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اوروں کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اس قدر ہے کہ وہ اپنے لئے آپ قانون بنا سکیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے صرف یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنے مالک کے قانون کو رائج کر سکیں۔ اس لئے اگر آپ نے اس قانونِ ابدی کے علاوہ کوئی اور قانون منتخب کیا تو مسلمان کے نزدیک یہ آزادی نہیں ہوگی۔ غلامی کی غلامی رہے گی۔ اور مسلمان کا سیاسی شعور اب اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ وہ غلامی کی لعنتی زندگی سے رستگاری حاصل کر کے۔ خواہ وہ غلامی اپنوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ قوم کیا کرے گی اسے چھوڑو۔ لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوگا۔ اسے سوچو۔ اور اس کے لئے خدا کی یہ وعید ہر وقت سامنے رکھو جو اس قسم کے لوگوں کے حق میں آئی ہے جہاں فرمایا کہ:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۲۸-۲۹/۱۴)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی عطا فرمودہ نعمت کو کفر سے بدل دیا۔ اور اس طرح اپنی قوم کو اس راحت و تسکین اور سرفرازی و سربلندی کی جنت کی طرف لیجانے کے بجائے تباہی اور بربادی کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں جو ٹھہرنے کے لئے نہایت بری جگہ ہے۔

آئینِ پاکستان

نیا ملک ہم کو دیا ہے خدا نے — کہ ہو اس میں جاری نظامِ محمدؐ
یہاں سے جو قرآن کا نور چمکے — ہو دنیا پہ روشن مقامِ محمدؐ
لڑائی کے میداں میں بھٹکے ہوؤں کو — ملے راہ امن و سلامِ محمدؐ
دکھائیں اخوت کا ایسا نمونہ — کہ ہر دل پہ ہو نقش نامِ محمدؐ
مساوات کا ہو یہاں دور دورہ — ہو سب کے لئے فیضِ عامِ محمدؐ
ہو مسلم کا برتاؤ غیروں سے ایسا — کہ وہ بھی کریں احترامِ محمدؐ
ہمیں قائدِ اعظم اپنا ہمیشہ — سناتا رہا ہے پیامِ محمدؐ
اسدؔ ہم اس امید پر جی رہے ہیں — کہ گردش میں آئیگا جامِ محمدؐ

حکومت کا آئین دینی نہ ہوگا!
یہ کیا کہہ رہا ہے غلامِ محمدؐ؟

(اسد ملتانی)

اصولی اختلاف

نہ کہ

ذاتی مخالفت

کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں کہ ۳۰ جنوری کی شام کو اس ناگہانی حادثہ کی اطلاع ملی جس نے ہندو قوم کو اسکی بلند ترین شخصیت سے محروم کر دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی شخصیت تھی جس نے ہندوؤں جیسے مجموعہ اضداد عناصر کو ایک قوم کی حیثیت دیدی اور انہیں دوسروں کی محکومی سے نکال کر ملک اور سلطنت کا مالک بنا دیا۔ ان لوگوں کو جن کے نزدیک صحیح آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں انسان کسی انسان کا نہیں بلکہ صرف احکام الہیہ کا محکوم ہو ہندوؤں کے نظریۂ آزادی سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس آزادی کے ہندو طالب تھے، اس کے حصول میں ان کے اس شفیق و غمگسار نے اپنی عمر کا ایک ایک سانس صرف کر دیا اور اپنی ان تھک کوششوں سے انہیں بالآخر ان کی منزل مقصود کے قریب پہنچا دیا۔ چونکہ مادی سیاست میں کامیابی کا معیار ذرائع کا جواز عدم وجواز نہیں، بلکہ مقصد کا حصول و عدم حصول ہوتا ہے۔ اس لئے اس نقطۂ نگاہ سے ہندو اپنے اس کامیاب ترین راہنما کے جس قدر بھی شکر گذار ہوں کم ہے۔ مقام عبرت ہے کہ اس قوم کا اتنا بڑا محسن خود اپنی ہی قوم کے ایک فرد کے ہاتھوں اس طرح بیدردانہ قتل ہو۔ حیرت ہے کہ نفرت کے جذبات انسانوں میں کس قسم کا جنون پیدا کر دیتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہماری دس سالہ سیاسی جد وجہد کا ایک سرسری سا جائزہ آپ کی نظروں سے گذریگا ظاہر ہے کہ یہ جائزہ اس سیاسی کشمکش پر تبصرہ ہے جس میں ہندو قوم، مسلمانوں کے جداگانہ حق حکومت کی مخالفت کرتی تھی اور چونکہ مہاتما گاندھی اس قوم کے نفس ناطقہ تھے اس لئے ان اختلافات کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ جو اس کشمکش میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان رونما ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلافات کسی کی ذات سے نہیں تھے بلکہ اس نہج و مسلک سے تھے جو فریق مقابل نے اس باب میں اختیار کر رکھا تھا۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں جہاں کہیں ان اختلافات کے ضمن میں مہاتما گاندھی کا ذکر آئے اسے اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ ہمارا اتفاق یا اختلاف اشخاص سے نہیں بلکہ ان اصولوں سے ہوتا ہے جن کے علمبردار وہ اشخاص ہوتے ہیں۔ اصولی اختلاف اور ذاتی مخالفت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور دنیا کی اکثر بدمزگیاں اس بنیادی فرق کو ملحوظ خاطر نہ رکھنے سے پیدا ہوتی رہیں۔ آئندہ صفحات میں اس اصولی فرق کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے۔

یہ چند تمہیدی الفاظ بطور معذرت نہیں۔ بلکہ بغرض اظہار حقیقت ضروری سمجھے گئے ہیں۔ اور اس ضرورت کو فوری طور پر سامنے لانے کا محرک وہ واقعہ ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پس منظر

حکایت قدآں یار دل نواز کنم
باین فسانہ مگر عمر خود دراز کنم

زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ مسلسل و غیر منقطع۔ اور حرکت پیہم اسی تسلسل دوام کی ذمہ دار۔ خارجی دنیا میں حوادث و وقائع کی کڑیوں کا باہمی ربط، شاہد زمانہ کے گیسوئے تابدار کے لئے وجہ تزئین، اور داخلی دنیا میں افکار و تخیلات کا نظم و ضبط، لیلائے وقت کے کاکل [illegible] کے لئے باعث تحسین۔ اگر خارجی دنیا میں ربط و تسلسل قائم نہ رہے تو تمام شیرازۂ ہستی بکھر جائے، اور اگر فکر انسانی میں نظم و ضبط باقی نہ رہے تو اسے ذہنی انتشار کا نام یا پاگل پن قرار پا جائے۔ طلوع اسلام کا نصب العین زندگی کے حقائق کو پیش کرنا ہے۔ لہذا اس کے لئے تسلسل فکر نہایت ضروری ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں اس کا پہلا پرچہ سامنے آیا اور جون ۱۹۴۲ء تک سلسلہ برابر قائم رہا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت میں عارضی تعطل پیدا ہو گیا۔ جب تک یہ شائع ہوتا رہا، یہ ایک ہی نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا۔ وہی نصب العین جسے قرآن نے صراط مستقیم کہہ کر پکارا ہے۔ راستہ اور سیدھا راستہ۔ راستے کی ضرورت اس کے لئے ہے جو چل رہا ہو۔ جو بیٹھ جائے اس کے لئے راستہ کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ اور راستے کا سیدھا ہونا اس کے لئے مفید جس کی منزل متعین ہو۔ جس کے سامنے کوئی منزل نہیں اس کے لئے راستہ کی صورت و سمت (ٹیڑھا پن اور سیدھا پن) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا بالفاظ دیگر طلوع اسلام کی دعوت، تعیین منزل (ایمان) اور حرکت پیہم (عمل) کی دعوت تھی ۱۹۳۸ء سے بس

دعوت کا سلسلہ رک گیا اور آج بفضلِ یزدی اس کا پھر اجرا ہو گیا۔ لہٰذا جہاں ہم آج کھڑے ہیں، اس سے پیچھے دو منزلیں اور تھیں۔ ایک ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک، اس کا دورِ اشاعت اور دوسری منزل ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک، اس کا دورِ التوا۔ افکار میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن راہوں سے یہ اپنے دورِ اوّل میں گذرا ہے ان کے اطراف و جوانب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے تاکہ وہ تمام نقوش جو مرورِ وقت اور اس کے عارضی التوا کی وجہ سے، کچھ دھندلے سے پڑ گئے ہیں، اجاگر ہو جائیں۔ اور پھر ان حوادث و واقعات پر بھی ایک سرسری سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس کے زمانۂ تعطل میں واقع ہوئے۔ تاکہ آگے بڑھنے سے پیشتر ماضی سے ہمارا رشتہ استوار ہو جائے اور ہمارے تسلسلِ ذہنی میں کہیں کوئی خلا نہ رہے۔ اس نگاہِ بازگشت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس طرح ہماری جنگِ آزادی کے اس دور کی تاریخ ہمارے سامنے آجائے گی جو ذرا آنے والے مؤرخ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے مقصود کیا تھا، اس کا اندازہ اس افتتاحیہ سے لگ سکتا ہے جس سے اس کی اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

افتتاحیہ دورِ اوّل

کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ایک غریب و نادار گداگر کی یہ عادت تھی کہ بیچارہ صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا، ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لئے بھی اتنا بھی نہ ملتا تو فاقہ کرتا۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی۔۔۔ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی بوسیدہ کٹیا ہی میں دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ گداگری کی تباہ حال زندگی اور بے نوائی لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار، ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج جاسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دیدینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کی سچی امداد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانہ کا پتہ دیدیتا آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرا دیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے یہ متاع گراں بہا قرآن کریم ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا؟

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے ترجمے سنتے ہیں تفسیر کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت کرتے ہیں اور کیا چاہیئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن محض حفاظت اور عقیدت تو مقصود بالذات نہیں۔ قرآن کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے۔ اور یہ دعویٰ خود قرآن کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حی و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستور العمل، ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے لئے خضر راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر ایک قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لئے جا رہا ہے جسے قرآن کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت، معاش و معاشرت، مذہب و سیاست غرضیکہ ہر مسئلۂ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رو سے ہونا چاہیئے اس کے تمام افکار و تخیلات، ان کے

تمام رجحانات قلبی و ذہنی اس کے تمام تصورات دینی و دنیاوی سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہوتی چاہیئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہوتی ہی۔ اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہوتو ہی۔ یہ سنئے تو اس کی مدد سے، دیکھے تو اس کی روشنی میں۔ سمجھے تو اس کی بصیرت سے۔ اور اس طرح یہ اس ایک دروازے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستانہ وار بے نیاز گذرتا جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھئے۔ وہ بلا تکلف کہدے گا کہ الحمدللہ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآن کریم سے ہی تلاش کیا جاتا ہے! کیا ان کا دستورالعمل حیات واقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے۔

اس کا جواب اپنے گردوپیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی زیادہ بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت عقیدت کی بنیاد پہ قرآن کریم سے لگاؤ کونسے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جواب تہذیب ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالئے جو کل کو امت مسلمہ۔ ملت اسلامیہ کہلانے والا ہے یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیمیافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسول کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیمیافتہ کے مکان پر جائیے دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآن کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں کو بڑے فخر سے آپ کے سامنے لائے گا یہ بتانے کے لئے کہ یہ اتنی سی عمر میں کس طرح فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابل تحسین بات ہے لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بیٹا! کلمہ بھی آتا ہے تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے!۔

پھر آپ ان کی درسگاہوں میں جائیے اور دیکھئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی نہیں

بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ ان تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے نوجوان مسلمانوں کا سا نام تو رکھتے ہیں کہ اس پر انہیں اختیار نہ تھا۔ اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مروڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہو سکے کہ آپ کس ملت سے متعلق ہیں لیکن ان کے قلب و دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوتی ہے جو ذرا متین و سنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف آتش خاموش سلگاتے رہیں گے جو بزعم خویش آزاد ہو چکے ہوں گے۔ وہ علانیہ تمسخر اڑائیں گے پھبتیاں کسیں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں۔ سب قصور ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے نا آشنا رکھا اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس نہج پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف سرکشی کے تمام سامان موجود تھے۔ اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی الٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہوں گے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہوگا۔ مفاد اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائق صد تحسین۔ لیکن سوچئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے! غور فرمائیے کہ کہیں آپ اس نیام کی نگہ پرداخت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے؟

باایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے روشناس کرا دیا جائے تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم مذہب سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحب ثروت دردمند مسلمانوں نے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوت غور و فکر دی جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بڑی بڑی سکیموں، شاندار پروگراموں، تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑ دیجئے وقت وہ آگیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں، ایک ایک دو دو کر کے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو

پھر سوچا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاع گم گشتہ اس کے اس کے چھپے ہوئے خزانے سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جائے جو ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ کا نقیب ہو اور ملت کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے اور نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کر سکے کہ قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دور حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دیکھتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لاتے سے شرمائیں بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک جا ہے اڑ کر چلا جائے۔ خدا کا یہ پیغام ازلی وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے۔ عدم سکون و فقدان اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے۔ وہی نظام کارفرما ہوگا جو قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرت انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالق فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغام ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملت اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتار زمانہ کے مقیاس پر ہوں اور ان کا اسلوب بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوق ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کریں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقع قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور نوع انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہن انسانی کی ہر سطح کے مطابق اس کے اندر موجود ہے۔

اس کے بعد رسالہ کے انتظامی امور کے متعلق کچھ تذکرہ تھا۔ اور آخیر میں لکھا تھا۔

لیکن یہ تمام انتظامات اور ان سے متعلقہ مساعی، یہ تمام تدابیر اور ان کی جزرسی۔ یہ ولولے اور یہ ارادے، یہ تجاویز اور ان کی تکمیل کے لئے کوششیں، یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع سب انسانی ہاتھوں کی تخلیق ہیں۔ جو غلطیوں سے مبرا نہیں اور سہو و فروگذاشت سے منزہ جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے، نہ اس پر تصرف و قدرت؛ لہٰذا یہ تمام انسانی کوششیں پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں اگر اس خدائے حی و قیوم کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال ہو کہ موت و حیات کامیابی و ناکامی فلاح و خسران اسی کے ہاتھ میں ہے، اس کی اعانت شریک کار ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کر دے کہ بڑے سے بڑے سازوسامان رکھنے والے انگشت بدندان رہ جائیں اور اگر وہی شامل حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور ان کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس لئے بھروسہ نہ اپنی تجاویز و تدابیر پر ہے نہ قوت و استعداد پر۔ بھروسہ فقط اس کی ذات پر ہے جو ہر کمزور اور ناتوان کا حقیقی آسرا۔ اور ہر نحیف و زار کا یقینی ملجا ہے۔ بازار مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی انٹی یقیناً ہر صاحب دولت و حشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن کیا عجب کہ اس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اسی انٹی کی قیمت دولت کونین سے بڑھ جائے رد و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شان استغنا میں ترحم خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے۔ کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو اور اس کے ساتھ یہ امنگیں اور یہ ولولے! بہرحال جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے لیکر اس شاہنشاہ گداؤں کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں اس التجا کے ساتھ کہ

کوہ آتش خیز کن ایں کاہ را — ز آتش ما سوز غیر اللہ را
رہروان را منزل تسلیم بخش — قوت ایمان ابراہیم بخش

ان دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اس کے رستہ میں اٹھایا جا رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ان حسین آرزوؤں اور مقدس تمناؤں کے ساتھ طلوع اسلام کا اجرا ہوا۔

حرکت مسلمان کی فطرت میں داخل ہے۔ سیمابیت اس کے ہیولیٰ میں شریک غالب کا حکم رکھتی ہے اگر کہیں خارجی اسباب و علل اس کے شعلۂ جوالہ کو آتش خاموش میں تبدیل بھی کر دیں، تو بھی اس کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ ذرا سی ہوا دینے سے چھپی ہوئی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے بربط ہستی کے بظاہر خاموش تاروں کو جذبات کے مضراب سے ذرا چھیڑ کر دیکھئے پوشیدہ نغمے کن بیتابیوں سے نکلتے اور فضا کو مرتعش کرتے ہیں ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں اس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے بظاہر جنگ آزادی کا نام دیا گیا۔ لیکن جو باطن اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر مبنی تھی۔ سابرمتی کے گوسالہ پرست سامری کی نگہ باریک بیں نے مسلمان کی فطرت سیمابیت کو بھانپا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی۔ مسلمان مذہب کے نام پر دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تحریک کا دامن تحریک خلافت کے ساتھ باندھ دیا۔ "دیوانہ را ہوئے بس است" پھر کیا تھا مسلمان بگولے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ ایک حرکت تھی لیکن بلا مقصد۔ ایک سفر تھا لیکن بلا تعیین منزل اس کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام جوش و خروش، یہ وجد و رقص بالآخر ہے کس لئے۔ "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ"؛ یہ تھا اس کا معمول۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر اس مرد مومن (حضرت اقبال علیہ الرحمہ) نے جسے مبدا فیض کی کرم گستری نے فراست ایمانی و بصیرت فرقانی سے نوازا تھا، ان کے سامنے، ان کی حرکت و عمل کے لئے ایک واضح نصب العین رکھا۔ لیکن جوش و خروش کے زمانہ میں ان باتوں پر کان کون دھرتا ہے؟ بہتوں نے اسے سنا تک نہیں اور جس نے سنا اس نے بھی اسے ان سنی کر دیا۔ ۱۹۳۸ء تک مسلمانان ہند کی یہی کیفیت رہی۔ تا آنکہ اس مرد قلندر کی دور بیں نگاہوں نے ایک ایسے معتدل مزاج مدبر کو بھانپا جس میں قوم کو اس واضح و درخشندہ نصب العین کی طرف لیجانے کی صلاحیت تھی۔ اس سے مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع

ہوا۔ وہ اصول مبانی جن سے اس نئے دور کا آغاز ہوا بالکل صاف اور سادے تھے۔ یعنی

(۱) اسلام کی رو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی حدود۔ وطن کی چار دیواری زبان اور نسل کا اختلاف سب غیر فطری امتیازات ہیں۔ نوع بشری کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے۔ یعنی تمام وہ لوگ جو نظام خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ایک قوم کے افراد اور ان کے علاوہ تمام انسان دوسری قوم کے افراد۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔ اسی تقسیم کو قرآن نے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اس معیار تقسیم کی رو سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک جداگانہ مستقل قوم کے افراد ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کسی صورت میں نہیں بن سکتے۔

(۳) مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں کہ غیر ملک کے حکام (انگریز) یہاں سے نکل جائیں اور ان کی جگہ یہاں کی ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی غلامی ہو گی جس طرح انگریزی حکومت ان کے لئے غلامی ہے۔ آزادی سے ان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے تصورات و معتقدات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر قدرت رکھیں اور دنیا میں قرآنی نظام رائج کر سکیں۔

(۴) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا ایک مستقل مسکن (Home land) ہو کیونکہ ہر دستی نظام کے قیام کے لئے زمین کا ہونا لازمی ہے۔

(۵) ہندوستان کی موجودہ شکل میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں حسن اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان کی الگ اور قائم بالذات حکومت ہو جائے۔ اسی کا نام تقسیم ہند ہے

چونکہ ہندو کے دل میں اپنی آزادی سے زیادہ مسلمان پر حکومت کرنے کا شوق چرا رہا تھا۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے اس مفہوم آزادی اور حصول حریت کو کس طرح تسلیم کر لیتا؟ اس سے اس کے "رام راج" کا خواب پریشاں ہو جاتا تھا اس لئے اس نے مسلمانوں کے اس حق وعدل پر مبنی دعوے کی مخالفت شروع کی۔ اور چونکہ مسلمانوں کے ان تمام دعاوی و مطالبات کا مدار اس بنیاد پر تھا کہ مذہب کی رو سے وہ ایک الگ قوم ہیں، انہوں نے یہ چلانا شروع کر دیا کہ مذہب ایک نجی (private) عقیدہ کا نام ہے جسے سیاست سے کوئی

واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو مخالفت ہونی ہی تھی۔ لیکن ہماری بدبختی کہ خود مسلمانوں میں سے ایسے لوگ بھی انہیں مل گئے جو مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت میں اُن کے ہمنوا ہو گئے۔ ہمنوا ہی نہیں بلکہ ان کے آلات مکبر الصوت بن گئے۔ آنے والے مورخ کے لئے یہ منظر بھی حیرت و استعجاب کی عجیب کیفیات پیدا کریگا کہ مسلمانوں کے اس دعوے کی وکالت کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے امور دینیہ کے عالم ہونے کا کبھی دعویٰ نہ ہوا۔ اور اس کی مخالفت میں وہ گروہ پیش پیش تھا جو اپنے آپ کو "حاملان دین مبین اور مفتیان شرع متین" کے القابات سے متعارف کراتا تھا! آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ مسلمانان ہند کی گذشتہ دس سال کی تگ و تاز اور جد و جہد خود اپنوں کی مخالفت کے مقابلہ کرنے میں صرف ہو گئی۔ طلوع اسلام کی چہار سالہ زندگی میں بھی روئے سخن زیادہ تر انہی حضرات کی طرف رہا اور اس باب میں اس کی مساعی جس انداز سے مشکور ہوئیں اس کے لئے ہم اس بارگاہ صمدیت کے حضور قدم قدم پر سجدہ ریز ہیں کہ اس کی توفیق و نصرت کے بغیر اس ہجوم مخالفت کا مقابلہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا

سوراجی اسلام یہ لوگ عوام کو یہ کہکر دھوکا دیتے تھے کہ جس آزادی کے طالب ہندو ہیں، اس میں مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے اور جس قسم کے مذہب کی آزادی ہندو اکثریت کی حکومت میں حاصل ہو سکتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے لئے جون ۱۹۳۸ء میں جناب راز ؔ کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ بہ عنوان "سوراجی اسلام" شائع ہوا جس نے فریق مقابل کی ابلہ فریبیوں کے نقاب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ والحمدللہ رب العالمین۔

اگست ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

تاریخ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں

واردھا کی تعلیمی اسکیم دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارتگری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز خاں و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحات تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد

کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دور جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا، عصر حاضر کا مہذب انسان اس دور وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس میں لئے انسانیت تڑپتی بلکتی پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن جو لوگ حقائق اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصر حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہد جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہد جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے، وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ تیاکر، جتا کر دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے آج اسی طرح کھلم کھلا ہوس خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاع حیات کو اس شفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے بدیں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دور جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفان بلاخیز ہیں جو کف بر دہاں بڑھتا، امنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ لیکن سطح آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سُن سکیں۔ اس پرسکوت طریق تخریب اور اس آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں۔ نہایت خاموشی سے اُس کے طریق تعلیم کو بدل دیجئے، وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاک و

بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھینچے چلی جائے گی اور اسے پتہ اُس وقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہوگی۔ حضرت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!؟

تعلیم کی یہ اہمیت، ہندو قوم کے سب سے بڑے راہ نما، مہاتما گاندھی کے پیشِ نظر تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی آیندہ نسلوں پر حکومت کرنا ممکن نہ ہوگا جب تک ان کے دینی تصورات کو نہ بدل دیا جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصابِ تعلیم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے شروع ۱۹۳۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس اسکیم کا نام "واردھا کی تعلیمی اسکیم" تھا۔ اس اسکیم میں ایسے ایسے زہریلے نشتر چھپا رکھے تھے کہ اگر یہ خدانکردہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آیندہ نسلوں کے رگِ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام میں اس دامِ ہمرنگِ زمین کا اس وضاحت سے تجزیہ کیا گیا کہ وَمَکْرُ اُولٰٓئِکَ هُوَ یَبُوْرُ (ان کی خفیہ تدبیریں سب برباد ہو گئیں) کی تفسیر سامنے آگئی۔ جس اقتباس سے اس عنوان کی ابتدا ہوئی ہے وہ اس مضمون کا افتتاحیہ ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنے پیشِ نظر اسلوبِ اشاعت یہ رکھا تھا کہ اس قسم کے اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا۔ چنانچہ اس مضمون کا پمفلٹ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا گیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ پشتو، گجراتی، ہندی، ملیالم، سندھی وغیرہ۔ اندازہ یہ کہ اس مضمون کے قریب اسی ہزار پمفلٹ ملک میں تقسیم ہوئے اور نتیجہ اس نشر و اشاعت کا یہ ہوا کہ وہ اسکیم بری طرح سے ناکام رہی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی زبان بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اس میں زبان کی غیر محسوس تبدیلی کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ سیدھا سادہ مسلمان اس حسین فریب سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اسے اس عظیم خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ شائع ہوا۔ جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی۔

زبان کا مسئلہ | واردھا اسکیم والے مضمون میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے ذیل میں ہندوؤں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان حیثیت القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انہیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا ورنہ ان کے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پرسکون لہروں سے تشبیہ دی تھی۔ میدان سیاست میں "متحدہ قومیت" کی ایک حسین تشکیل کا تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، "بدیشی حکومت کے خاتمہ" کے دل فریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلاف مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیان عالم پر فوقیت رکھتا ہے چونکہ ان کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم کی تجویز کی جا رہی ہے جو اکبر کے دین الٰہی۔ یعنی دور جدید

کے برہمو سماج کے خطوط پر متشکل ہے۔ ہمسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے اس لئے اس کی جگہ اہمسا کا فلسفۂ حیات جبت قلب و نظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو " روحیت " کے دلکش غلاف میں لپیٹ کے ایسا خوش آیند - سہانا - بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے

مسئلہ کی اہمیت مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے۔ کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے۔ کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق! لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور جس قوم کی زبان میں اپنا خود لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے، اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

یہ ایک تنگ نظر مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ کشادہ ظرف " ہندو بھی اس کے مؤید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں

" ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے، اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ

وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص۔ ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ اس امر کو کہ سب کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجہ کی خوش حالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو۔ جب وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے، اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں، اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔ (میری کہانی جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجیئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

اس مضمون کا پمفلٹ بھی بار بار چھپا اور اطراف و جوانب میں پھیل گیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس سیاسی کشمکش کے دور میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت تھا۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک اہم بحث کا سلسلہ چھڑا۔ بات یوں ہوئی کہ "مولانا" حسین احمد صاحب، شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں" چونکہ یہ نظریہ

اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اور پیش ہو رہا تھا ایک ایسے گوشے سے جسے مسلمانوں کی دینی تعلیم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لئے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ آتشیں کی شکل میں ان الفاظ میں ہم تک آپہنچی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ ۔ ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (علامہ اقبالؒ)

جناب حسین احمد صاحب، بجائے اس کے کہ ان اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے۔ اُلٹے فعل پر آتش ہو گئے اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع کر دیا جس میں فرمایا کہ

> یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد، جغرافیائی حدود، یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی بجائے، شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔

علامہ اقبالؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے لیکن معاملہ کی نزاکت اور اہمیت کے احساس نے انہیں مضطرب و بے قرار کر دیا اور نظریۂ قومیت کے متعلق انہوں نے وہ بیان شائع فرمایا جو اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بیان ایسا مسکت و جامع تھا کہ جناب حسین احمد صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ "میرا مقصد دہلی کی تقریر میں اخبار تھا۔ انشاء نہ تھا۔" بات ختم ہو گئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد جناب حسین احمد صاحب نے مرحوم کے متذکرہ صدر بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ، بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا۔ طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ اس کے جواب میں قرآن کریم کے نظریۂ قومیت کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ملتِ اسلامیہ اس کے برعکس غلط تعلیم کے مسموم اثرات سے محفوظ

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد

رہ جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء کے رسالہ میں اس عنوان پر ایک مبسوط و جامع مقالہ شائع ہوا جس کا جواب کسی سے نہ بن پڑا۔ اور یہ سب اللہ کی توفیق سے ہوا۔

اس سیاسی کشمکش کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ ملت اسلامیہ کی اکثریت مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور الگ حکومت کے دعوے کی تائید میں تھی لیکن "قومیت پرست" گروہ ان کی مخالفت میں دن رات مصروف تھا اور یا للعجب کہ اس مخالفت میں جمعیۃ علمائے ہند صف اول میں تھی۔ آٹھ نو برس ہو چکے تھے کہ جمعیت کا کوئی سالانہ اجتماع نہیں ہوا تھا لیکن اس مخالفت کے جوش نے ان میں پھر سے حرکت پیدا کی اور اوائل مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ان کا اجتماع ہوا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور ایسے وقت میں مسلمانوں کے ملی مطالبہ کی مخالفت میں ایک ایسا اجتماع خاص اہمیت رکھتا تھا۔ طلوع اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے غلط رو بھائیوں کو سیدھا رستہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے چنانچہ اس اجتماع کی تقریب پر اس کی طرف سے ایک جامع مقالہ بعنوان "عرضداشت بخدمت علمائے کرام" شائع ہوا اور جلسے کے پہلے دن خاص اہتمام سے اسے مفت تقسیم کیا گیا۔ اللہ نے اس کی اس کوشش کو مشکور فرمایا۔ اور عوام اس فریب کا شکار ہونے سے بچ گئے جو اس معصوم انداز سے کھیلا جا رہا تھا۔

پہلی سال گرہ

اس طرح طلوع اسلام کی زندگی کا پہلا سال ختم ہوا اور دوسرے سال کی ابتدا ان حوادث اور الجھاؤں کے ساتھ کی گئی۔

اس خدائے حی و قیوم کے نام سے جو حیات و قوت کا سرچشمہ اور زندگی و توانائی کا مبدا ہے۔ طلوع اسلام اپنی عمر کے دوسرے سال میں اس شکر و شکایت کے ساتھ قدم رکھتا ہے کہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغان سحر خواں میری صحبت میں ہیں خرسند

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

شکر اور بے پایاں شکر اس کی توجہات کرم کا۔ اور شکایت اور بے غایت شکایت اس تقدیر کی جس کے خلاق خود ہمارے اپنے اعمال ہیں۔ اور جس کی وجہ یہ بکھرا ہوا نظام ہے۔ بہر حال یہ بھی اسی کے گوشۂ چشم التفات کا تصدق ہے کہ اس جاہلیت کی جہنمی زندگی کا احساس تو ہو گیا جو ایک عرصہ سے جنت نگاہ بن رہی تھی۔ دعا ہے کہ جب یہ احساس دیا ہے تو اس زندگی کو بدل ڈالنے کی توفیق بھی عطا کر دے۔

بیا ساقی! بگرداں جام مے را — ز مے سوزندہ تر کن سوز نے را

دگر آں دل بنہ در سینۂ من — کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را

زندگی نام ہے آرزو کا — آرزو جس قدر زندہ ہو۔ زندگی اتنی ہی تابندہ ہوتی ہے۔ طلوع اسلام زندہ آرزوؤں اور درخشندہ تمناؤں کی ایک حسین جنت در آغوش۔ اس شاہنشاہ عالم کے آستانۂ اقدس پر جھولی پھیلائے کھڑا ہے جس کے ابر جود و سخا کی گوہر باریوں سے ہر خشک ٹہنی بہار صد گلستاں بداماں ہے۔ چہ عجب کہ اس کی عاجز نوازیوں سے اس کی شاخ تمنا بھی سرسبز ہو جائے۔

ارادے نہایت بلند ہیں لیکن ان کی تکمیل۔ اے چارہ ساز بے کساں! صرف تیرے ہاتھ ہے۔ عزائم بڑے راسخ ہیں، لیکن ان کی بر آوری۔ اے مدد فرمائے ناتواں صرف تیری عطا کردہ توفیق پر منحصر ہے۔ اے رب العزت سہارا صرف تیری ذات کا سہارا ہے آسرا صرف تیرا آسرا ہے۔ باقی بتان آذری جو کچھ ابھی ہماری دنیائے تخیلات میں ہے اسے

محسوس پیکر عطا فرماتے جو عالم تصور میں ہے اسے مشہود بنا دے بشرطیکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ ہمارے لئے بہتر ہو۔ تیرے بتلائے ہوئے راستے کے مطابق ہو ایسے خوابوں کو حقیقت بنا دینا صرف تیرے اختیار میں ہے ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

ان دعاؤں اور ان التجاؤں کے بعد ایک نصیحت اس "طفلک یکسالہ" (طلوع اسلام) کے لئے بھی ہے۔ ؎

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا — خیز و بر داغ دل لالہ چکیدن آموز
اگرت خار گل تازہ رسے ساختہ اند — پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابان تو برکند ترا — صفت سبزہ دگر بار دمیدن آموز

تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں
عزلت خمکدہ گیر و رسیدن آموز

واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

کانگریس بے نقاب

طلوع اسلام کی شروع ہی سے یہ پکار رہی کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے آزادی کی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک خالص ہندو مذہبیت کی تحریک ہے اور مقصد اس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" کا قیام ہے۔ قومیت پرست مسلمان اس کی تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تحریک خالص سیاسی تحریک ہے۔ اس میں ہندوؤں کے پیش نظر کوئی ایسے عزائم نہیں۔ لیکن یہ راز کب تک مستور رہتا۔ اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے جنرل سیکریٹری، اچاریہ کرپلانی کی طرف سے کانگریس کے عزائم و مقاصد

سے متعلق ایک مبسوط بیان شائع ہوا جس میں اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ کانگریس کی تحریک اس فلسفۂ زندگی کے احیاء و ترویج کی تحریک ہے جسے مہاتما گاندھی پیش کر رہے ہیں۔ کانگریس کو محض سیاست کے دائرہ تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ اس کی تحریک ہر گوشۂ زندگی کو محیط ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں، طلوع اسلام کی طرف سے اس بیان کا تجزیہ کیا گیا۔ اور قومیت پرست مسلمانوں سے پوچھا گیا کہ۔

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما!

کانگریس کی اس طرح نقاب کشائی سے بہت سی سعید روحیں اپنی غلط روی پر متنبہ ہو گئیں اور باقی وہی رہ گئے جن کے پیش نظر کچھ اپنے مقاصد تھے۔

یوم نجات

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت، کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اڑھائی سال تک مسلمان اقلیت پر جس جس انداز سے مظالم توڑے۔ اُن کی یاد آج بھی ہر قلب حساس کو طلسم پیچ و تاب بنا دیتی ہے خدا خدا کر کے اس دور استبداد کا خاتمہ ہوا۔ جب کانگریسی وزراء نے اپنے عہدوں سے استعفے دیدیئے۔ اس بلائے عظیم سے رستگاری پر مسلم لیگ نے "یوم نجات" منایا اور اس سلسلہ میں طلوع اسلام نے ایک جامع پمفلٹ میں بتایا کہ مسلمانوں کے یہ سجدہ ہائے تشکر و امتنان اس لئے ہیں کہ مسلمان دنیا میں نہ انگریز کا غلام رہ کر جی سکتا ہے نہ ہندو کا۔ یہ صرف اپنے اللہ کا غلام اور اس کے آئین کا محکوم رہ کر ہی بہ حیثیت مسلمان زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسی پرچہ (جنوری ۱۹۴۰ء) میں "نیشنلسٹ علماء" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی جو ان حضرات کے سامنے ان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی ایک جاذب کوشش تھی۔

مسلم لیگ کی اس نشأۃ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوا۔ دو سال کے عرصہ میں ملت اسلامیہ کے

اس اہم "مقدمہ" کے وکیل نے اس کے اصول و مبادیات کی تشریح و توضیح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ "مسلمان ایک مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں؛ مسلم لیگ اس قوم کی واحد نمایندہ جماعت ہے" یہ تھے وہ بنیادی اصول جو اس دس سال کے عرصہ میں بدلائل نیرہ و براہین قاطعہ، دنیا کی عدالت میں بار بار پیش کئے گئے۔ اب وقت آچکا تھا کہ اس قوم کے اصل دعوے کو واضح الفاظ میں سامنے لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۴۰ء میں، لاہور مسلم لیگ کا وہ معرکۃ آرا اجلاس منعقد ہوا جس نے نہ صرف ملت اسلامیہ کی تقدیر بدل دی بلکہ دنیا کے نقشے میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اس تقریب پر، ملت اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا، قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمت میں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاس نامہ تھا۔ ہم اس سپاسنامہ کو بصد فخر و مسرت اس مقام پر پھر دہراتے ہیں

بہ شرف نظر!

شیر بیشۂ حیا کی و حریت۔ ضیغم نیستان جرأت و بسالت۔ شاہین افلاک تدبر و سیاست۔ پروانۂ شمع اخوت و حمیت۔ طرۂ کلاہ ملک و ملت۔ بطل جلیل ہندوستان۔ و قائد اعظم اسلامیان عظمت نشان

محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی

حریت نواز! ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشان منزل سے مایوس ہو کر ضعف عزیمت سے پاشکستہ، بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آواز جرس کا کام دے رہی تھی۔ فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا، سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامن صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، پادر ان

یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افراد قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو، ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دور افق کے اس پار سے ایک شاہسوار رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افراد کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لیجانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملت اسلامیہ ہندیہ کی ہے۔ تحریک آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑائے جاتا، پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہائے جاتی۔ اس کاروان بے سالار کی متاع گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ اپنی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں۔ ملت بیضا کو صدائے طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مرد راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہ نمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزم ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذات گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگہ دوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں، وہ گھاٹیاں کہ جن میں کیسے

"متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسولِ کافۃ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا کہیں "اس اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولّی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنیِ آتش نفس "سرود گاہِ واردھا" کی استعارے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب شاہین بچوں کے لئے اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے Gentlem-an's agreement) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متأثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دیدینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملت اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ نبضِ سیاست پر آہنی پہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگئے

آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خواب پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

لعل جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور رستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جاں گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سستی اور ذاتی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ دار دھلا Radio Station کے آلہ مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت میں اذیں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

جن کا مقصود وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام دبقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکر بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوک نیشتر سے بچا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دل خراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے ید بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بحیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بحیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدء فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دل پرسوز و پر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے تجھ کو حدیث رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتی ملت کی متاع گراں بہا ہے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اس قوم کا سواد اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے، اور ان کی خاطر آپ نے جو گرانقدر قربانیاں کی ہیں، ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملت اسلامیہ کے اس اجتماع عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے

سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نکتہ نگاہ سے (Constitutionally) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپکی نگاہ سے مستور نہ ہوگی۔ کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ۔ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مرد خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے یہ طوفان بلاانگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ

سید القوم!

ادارۂ طلوع اسلام جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے قوم کو اس کی طرف اور تیزگامی سے بڑھاتے جائیے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سربکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ارکین ادارۂ طلوع اسلام۔ دہلی

یہ سپاس نامہ اس قائد کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ملت اسلامیہ کی راہ نمائی اس کی متعینہ منزل کی طرف کر رہا تھا۔ لیکن بعید از سپاس گزاری ہوتا اگر اس موقع پر ملت اسلامیہ کے

اس محسنِ اعظم کی یاد تازہ نہ کرائی جاتی جس نے ملت کے لئے خود اس منزل کو متعین کیا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، ذیل کی سطور بھی اسی پرچہ میں باعث ہزار فخر و مباہات شائع ہوئیں۔

صبحِ امید

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبالؒ)

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے، مسلمانوں نے ایک مدت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ کے جمود و تعطل کی برف کی سلیں حوادث زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں، ایک وحشت ناک بیابان میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد کو لیں اپنی متاع گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساس زیاں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی دَنْد و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے۔ لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا نہ نشانِ راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف۔ کشتیٔ ملت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جداگانہ انتخاب اور تخصیص نشست و نیابت کے سود و زیان کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ رہے تھے۔ اُن کے مطالبات۔ مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گھر کر رہ چکے تھے۔ اور ان کی نگاہیں جمہوری نظامِ حکومت کی بظاہر درخشندہ افق پر جا کر رک چکی تھیں۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے جنہیں فطرت نے صرف دانشِ برہانی عطا فرمائی تھی۔ وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے اسباب و عوامل اور حوادث و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہنچ سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی، لیکن اس محشرستان انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک ایسا بندہ بھی موجود تھا جسے مبدء فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ دانشِ نورانی کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے

حقائق و معارف پر تدبر و تفکر سے ایک مرد مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور ان مشاہدات سے اس کے آئینہ ابراک میں آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر، نظر آ جاتی ہے۔ اس کی نگۂ دوررس آشیانہ کی نظر فریب پائیداری کے بجائے اس شاخ کی نزاکت پر ہوتی ہے جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آیند الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے اور وہ ان ہی حقائق کی دوربین سے پردہ افلاک کے پیچھے چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے۔

ہاں! تو اس ہنگامہ زار انتشاد و خلفشار میں یہ مرد مومن، جسے قسام ازل نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا۔ اُٹھا، قافلہ کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا۔ اور کہا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ قرآن کریم نے تمہاری منزل کون سی متعین کر رکھی ہے۔ اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیش نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی صراطِ مستقیم ہے اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ:-

> اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل۔ کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے، برعکس یوروپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ نا استوار ہو گا! (اقبالؒ)

جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل مختلف اللسان۔ مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ اُن کے نظریۂ زندگی کی بنا رکسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یوروپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔ .....

..... میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کی حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے۔ یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقے میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھانے گا۔ ..... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقاء کا موقعہ ملے۔ اپنے

کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب
قریب ناممکن ہے۔ جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے
بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں
کا غلبہ اور تسلط ہو.....

(خطبہ صدارت حضرت علامہ اقبالؒ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اس لئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان و عمل صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور مسلمان دنیا میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومت خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی۔ اس لئے کسی نے اسے درخور اعتناء نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہکر ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالم تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ زا دماغ کی اُپج ہے۔ جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں۔ بلکہ مجموعہ ممالک قرار دیتا ہے، جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل بالذات جداگانہ قوم گردانتا ہے۔ جو اس بیسوی صدی میں جمہوری نظام حکومت کو ہندوستان کے لئے ناقابل عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان کے دو ٹکڑے کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سُنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

وقت گذرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ اور ابھی دس برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاست ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں جو

۱۹۳۰ء میں اس "دیدہ بینائے قوم" نے پیش کیا تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ آج یہ سائل ایک ایک کر کے واضح اور بین طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے، مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ بنا بریں مغربی انداز کا نظام جمہوریت یہاں قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان امراض کا واحد علاج تقسیم ممالک ہے۔ آج اس کے لئے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا اور اسی طریق عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا، وہ بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ ہندی مسائل سیاست کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔ مثلاً مسٹر این۔ سی۔ دت (سابق رکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:-

> ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ حرج نہیں یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے

مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم واصلاح کرکے اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

(مدینہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادث زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان، ضعف عزیمت و شدت انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا جو ان چٹانوں کو ریت کے ذروں میں تبدیل کر دے جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں۔ لیکن جب اس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے اور اس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہونچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے تو ان عارضی حوادث وموانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اٹھاتے چلئے چند دنوں کے بعد آپ دیکھ لیں گے کہ بتوفیق ایزدی اسی مرد راہ بیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار — نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک — بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائیگا پیغام سجود — پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور — خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(اقبالؒ ۱۹۱۲ء)

مارچ ۱۹۴۰ء میں ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کرسی صدارت سے راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد، اعلان فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کا دعوئے آزادی غلط

ہے انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر جینا ہوگا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے یہی قرآن کا ارشاد ہے۔ ادھر یہ دونوں اجتماعات، لاہور اور رام گڑھ میں انعقاد پذیر تھے اور ادھر جبریل اور ابلیس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہو رہے تھے۔ زمین اس بدبختی پر روتی تھی اور تقدیر اس پر ہنستی تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں جناب آزاد کے خطبۂ صدارت پر ایک جامع تبصرہ شائع ہوا۔ جس میں اہنیتا یا گیا کہ ان کا آج کا قرآن، ان کے تیس برس پیشتر کے قرآن سے کس قدر مختلف تھا!

جہان نو

جب ملت اسلامیہ کے اجتماع لاہور نے اپنے مطالبہ کو واضح طور پر متعین کرکے اس کا اعلان کر دیا تو ضرورت تھی کہ اس مطالبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس کے ماعلیہ وما لہٗ پر بالوضاحت تنقید و تبصرہ سے اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا جائے کہ یہ مطالبہ کیا ہے؟ کس لئے کیا گیا ہے؟ اور اس کے حصول کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے لئے جون ۱۹۴۰ء کے رسالہ میں اسی صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون بعنوان "جہان نو" شائع ہوا جس نے فی الواقع دنیا کو ایک "جہان نو" سے متعارف کرایا۔ اس سے پیشتر بہت کم لوگ تھے جنہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمان اس مطالبہ پر کیوں مجبور ہے۔ اس سے حقیقی مقصود کیا ہے۔ اور یہ کہ اس "جہان نو" کے قیام سے کس طرح اس دنیائے کہن کا جہنم تسکین و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔

۱۹۴۱ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس، مدراس میں منعقد ہوا۔ اور وہاں پاکستان کے نظریہ کو بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیگ نے اب اپنا نصب العین ان الفاظ میں متعین کیا۔

> مکمل آزاد ریاستوں کا استقرار، جو اس طرح متعین کی جائے گی کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مسلمانوں کے تل نشین ہوں گے ان کی حکومت میں کسی غیر کا عمل دخل نہ ہوگا۔

پاکستان کا نظریہ، اب آہستہ آہستہ خاور جہاں تاب کی درخشندہ شعاعوں کی طرح مطلع سیاست ہند

پر چھائے جا رہا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ باطل کی ظلمتناکیاں چپکے چپکے دبے پاؤں پیچھے کو سرکتی جا رہی تھیں۔ اس تذبذب کا آئینہ دار وہ خطبۂ صدارت تھا جو جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور کی تقریب پر جناب حسین احمد صاحب مدنی نے ۱۹۴۲ء کے شروع میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لایا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت تصور کر کے ان کے سیاسی مسائل کا حل نہیں سوچنا چاہیئے، بلکہ انہیں ایک قوم کی حیثیت دینی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

> ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیئین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں۔ یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے

تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے انہیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں۔ اور اگر صوبوں کی از سر نو تجدید اور توسیع کی جائے تو وہ تیرہ موجودہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دیگر اقلیتوں میں انہیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جا سکتا ہے۔

یہ رجحانات اس حقیقت کے غماز تھے کہ یہ حضرات اب کس طرح اپنے دل کی گہرائیوں میں ملت اسلامیہ کے دعاوی و مطالبات کو حق بجانب محسوس کرتے تھے۔ لیکن ہماری شوریدہ بختی کہ اس کے باوجود انہیں یہ جرأت نصیب نہ ہوئی کہ اس احساس کا کھلے بندوں اعتراف کر لیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ قوم کی تگ و تاز جو آج مخالفت کے مقابلہ میں صرف ہوئی کسی تعمیری مقصد کے لئے کام آتی اور آج اس کا مقام، اس کے موجودہ موقف سے کہیں بلند ہوتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ایک مدت میں جا کر ہو سکے گی۔

ان حضرات کا سب سے بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسٹر جناح امور دین سے واقف نہیں۔ اس لئے اہل مذہب کے نزدیک ان کا پیش کردہ نصب العین درخور اعتنا نہیں ہو سکتا۔ اول تو اس صغریٰ و کبریٰ کی کڑیوں میں کوئی باہمی ربط نہ تھا۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ جو نصب العین پیش کیا جا رہا ہے وہ غیر اسلامی ہے یا دین کے عین مطابق! لیکن انہی دنوں بعض چیزیں ایسی بھی سامنے آ گئیں جن سے یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ مسٹر جناح نے جس نظریہ کو صحیح سمجھا ہے وہ کس طرح دین کے مطابق ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں مسٹر جناح حیدرآباد تشریف لے گئے تو بعض نوجوانوں نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ یہ مکالمہ شروع سنہ ۱۹۴۲ء میں اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوا۔ اسے اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کے طلوع اسلام میں نقل کیا گیا۔ وہ مکالمہ حسب ذیل تھا۔

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے

محاورے کے مطابق لا محالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوٰے ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور نا ممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب:۔ اشتراکیت بالشویکیت، یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:۔ ترکی حکومت تو ایک سیکولر سٹیٹ ہے کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت (Secular State) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل واضح ہے اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی

سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال:۔ وہ سلطنت ہمیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے

جواب:۔ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم اس کی جدوجہد۔ اس کا رُخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار، دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کرے۔

جواب:۔ (دقت یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں۔ ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

اب پاکستان کا نظریہ عام ہو رہا تھا۔ ادھر اُدھر سے اس کی تائید میں آوازیں بھی اُٹھ رہی تھیں۔

چنانچہ اوائل ۱۹۴۲ء میں مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اپنا وہ فارمولا پیش کیا جس میں فی الجملہ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر سر سٹیفورڈ کرپس آئے تو انہوں نے بھی اپنی تجویز میں اس کی طرف رجحان ظاہر کیا۔ لیکن یہ چیزیں صرف ہوا کا رُخ بتا رہی تھیں۔ کشتی ملت کو ساحل مقصود تک پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے لئے ابھی اور جدوجہد اور سعی و کاوش کی ضرورت تھی۔ یہ ہنگامہ اسی طرح سے گرم تھا کہ جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ہجوم کر کے امنڈ آئے اور طلوع اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بعد مجبوری معرض التوا میں پڑ گیا۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گذرا ہے، وہ طلوع اسلام کے میدان سعی و عمل کے صرف ایک گوشے سے متعلق تھا۔ اس سے کہیں اہم وہ دوسرا گوشہ تھا جس کا اجمالی سا خاکہ اب آپ کے لئے وجہ نورانیت قلب و نگاہ ہوگا۔ گوشۂ اول ملت اسلامیہ کے اس مطالبہ کی تائید میں تھا، جسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن طلوع اسلام کے نزدیک مسلمانوں کی تگ و تاز مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ایک بلند و بالا مقصد عظیم العظمت کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں۔ اور چونکہ اس کے لئے کسی ایسے خطۂ ارض کا ہونا ضروری تھا جس میں کسی غیر کا دخل نہ ہو، اس لئے پاکستان کا حصول اس کے لئے لابدی تھا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کی ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری تھا کہ حصول خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ زمین پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ تھا طلوع اسلام کی مساعی کا دوسرا گوشہ۔

یوں تو طلوع اسلام کی ہر سطر اسی ایک منزل کی طرف دلیل راہ بنتی تھی لیکن اس باب میں اہم مضامین کا ایک مستقل سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں جناب پرویز کا ایک حقیقت کشا مضمون اجتماعی زندگی شائع ہوا جس سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں علامہ اسلم جیراجپوری کا

مضمون "اسلامی نظام" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں قرآنی آئین حکومت و سیاست مدن کے بنیادی خدوخال سامنے آ گئے۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں اس اجمال کی تفصیل میں پرویز صاحب کا مضمون "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں "اسبابِ زوالِ امت" کے موضوع پر، علامہ اسلم صاحب کا ایک اہم مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے تاریخ و قرآن کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا جو ایک مدت سے ہر صاحبِ فکر کی توجہ کو مرکوز کئے ہوئے ہے کہ

ہیں آج کیوں ذلیل جو کل تک تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس باب میں سب سے اہم سوال جو اکثر سامنے آتا ہے یہی ہوتا ہے کہ قرآن جس قسم کے دولتی نظام کی تشکیل چاہتا ہے اس کے اصول و مبانی کیا ہوں گے۔ اس موضوع پر مئی ۱۹۳۹ء کے طلوعِ اسلام میں جناب پرویز کا مضمون "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس میں وضاحت سے بتایا گیا کہ دنیا میں قوت اور دولت کا غلط مصرف فسادِ آدمیت کا باعث ہوتا ہے۔ اور قرآن جس نظام کو دنیا میں وجۂ شرفِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اس میں قوت اور دولت کے غلط استعمال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا اور احترامِ آدمیت کہ جو درحقیقت سرچشمہ ہے ہر قسم کے شرف و مجد کا، اس نظام کا بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔

اسی سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اس نظام میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا؟ یہ سوال تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں کی آبادی میں ایک نمایاں حصہ غیر مسلموں کا تھا چنانچہ اس موضوع پر، جون ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں "اسلام اور مذہبی رواداری" کے عنوان سے جناب پرویز کا دوسرا اہم مقالہ شائع ہوا۔ جس میں قرآنی نصوص اور تاریخی نظائر و شواہد سے اس حقیقت مستور کو بے نقاب کیا گیا کہ قرآنی نظام کے متعلق غیر مسلم مورخین نے دنیا کو کس قدر فریب میں مبتلا رکھا ہے اور اس طرح اس کے حسین چہرے کو کس قدر بھیانک عفریتی نقوش میں پیش کیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پرویز صاحب کا عظیم القدر مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص دل کش انداز میں بتایا کہ مسلمان کی حقیقی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے اور عجمی تصورات اور غیر قرآنی نظریات نے اسے کہاں سے کہاں بنا دیا ہے۔

اسلام نے جو اجتماعی نظام، امت کے لیے تجویز کیا ہے، اس کا مرکز کعبہ اور محیط تمام کرۂ ارض ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جس طرح کعبہ کے مرکزی اجتماع کو محض ایک "یاترا" کی حیثیت دے رکھی ہے اس نے اس عظیم القدر اور مہتم بالشان نظام کو جسد بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ کو واضح طور پر سامنے لانے کے لیے، دسمبر ۱۹۳۹ء میں علامہ اسلم جیراجپوری کا پُر مغز مقالہ "حقیقت حج" شائع ہوا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۴۰ء کے پرچہ میں جناب پرویز کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ جس طرح مسلمانوں کی تمام حرکت و عمل کا مرکز کعبہ ہے اسی طرح ان کے آئین و ضوابط کا مرکز قرآن ہے۔

لیکن قرآن اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے تمام انسانی تخیلات سے مبرا رکھا جائے، یہ انسانی تخیلات کن کن لطیف راہوں سے قرآن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انہوں نے عقیدت و عظمت کی مقدس نقاب اوڑھ کر کس طرح مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پکڑ رکھی ہے، اس کا تجزیہ جناب پرویز کے مبسوط مضمون "شخصیت پرستی" میں کیا گیا۔ جس کی پہلی قسط مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۴۰ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون "ختم نبوت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں "ایک آنے والے" کے مجوسی عقیدہ کی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا۔

عجمی تصوف کے ترک دنیا کے فلسفہ نے جب مسلمانوں کی زندہ اور زندگی بخش دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر دیا، تو نہ اُن کے ذہنوں میں ندرت افکار رہی نہ بازوؤں میں قوت تخلیق۔ دماغ، تقلید جامد کی برفانی سلوں سے مفلوج ہو گئے اور وہ آہنی پنجے جو پتھروں کے سینہ میں چھپی ہوئی چنگاریوں

کو کھینچ کر اپنے قبضۂ قدرت میں لے آیا کرتے تھے۔ مصروف ہیچ شماری ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام علوم و فنون کفار کا حصہ قرار پا گئے۔ اور محکومی و محتاجی کی ذلیل زندگی کو اللہ کی رحمت قرار دیکر مسلمان نے یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس عجمی افسون کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن نے علوم طبیعی میں غور و فکر کرنے اور اشیائے کائنات سے نفع اندوز ہونے کی کس قدر تاکید کی ہے۔ اور جب قرآن کی صحیح تعلیم مسلمانوں کے سامنے تھی تو اس باب میں انہوں نے کس قدر تجسس و کاوش سے کام لیا تھا۔ اس موضوع پر جناب پرویز کا تحقیقاتی مقالہ اسلام اور سائنس۔ مارچ ۱۹۴۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون بعنوان فردوس گم گشتہ۔ شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ جنت ارضی جس کے ہم کبھی وارث تھے کس طرح ہماری نگاہوں سے گم ہو گئی اور اب اس کی بازیابی کی کیا صورت ہے۔

ہندوؤں کو مسلمانوں سے کسی اور باب میں تو خطرہ نہیں تھا۔ اور جو خطرات تھے ان کے مقابلہ کی تیاریاں وہ ساتھ کے ساتھ کئے جا رہے تھے۔ لیکن ایک میدان ایسا تھا جس میں انہیں ان کی طرف سے خطرہ یقینی تھا اور مشکل بالائے مشکل یہ کہ اس خطرہ کے مقابلہ کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہ تھا یہ میدان مذہب کا تھا انہیں خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تو ہندومت اس کے مقابلہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکے گا۔ یہ خطرہ ان کے لئے ہر وقت باعث سوہان روح تھا اس کی روک تھام کے لئے۔ مہاتما گاندھی نے اس فلسفہ کا پرچار شروع کیا کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مطلب واضح ہے کہ اگر ہندومت اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی سطح تک پہنچ جائے تو اسلام کو اس کے مقام سے نیچے اتار کر ہندومت کی سطح پر رکھ دیا جائے۔ لیکن گاندھی جی اس حربہ کے کمزور پہلو سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے مسلمانوں پر اس کا اثر کچھ نہیں ہو گا کہ اسلام اور ہندومت ایک جیسے مذہب ہیں اس لئے

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر ترجمان القرآن نے پورا کر دیا جس میں مختلف انداز سے اس چیز کو ابھارا گیا کہ "عالمگیر صداقتیں" تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ یہ خطرہ بہت دور رس تھا۔ اس لئے کہ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم قرآن کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور ان کے الفاظ کا جادو مسلم تھا۔ اس سحر سامری کی شکست و ریخت کے لئے جناب پرویز کا ایک مدلل اور مسکت مضمون "کیا مذاہب یکساں ہیں" اگست ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں شائع ہوا جس نے اس طلسم کی عنکبوتیت کو بے نقاب کر کے رکھدیا۔

اس کے بعد اکتوبر اور دسمبر میں ان کے اور اہم مضامین "نجات کا قرآنی نظریہ" اور "نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم" شائع ہوئے۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں ان کا ایک اور مضمون بعنوان "اپنی آنکھ اور قرآن کریم" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کے شمع نورانی پر غیر اسلامی تصورات کے رنگین فانوس کس کس انداز سے چڑھائے گئے ہیں۔

اس مختصر سے تعارف سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہنگامی سیاست پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ طلوع اسلام نے قلب و نگاہ کی صحیح تعمیر کے لئے کیا کچھ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں سے ایک ایک مضمون، اپنی جگہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس کا التزام کیا ہے کہ ان تمام مضامین کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کی افادیت ہنگامی اور عارضی نہیں مستقل ہے۔

اس مقام پر اسی سلسلہ کی ایک اور اہم کڑی کا ذکر بھی غیر محل نہ ہوگا۔ اگرچہ اس کا تعلق براہ راست طلوع اسلام سے نہیں لیکن بالواسطہ اس سے تعلق ضرور ہے۔ جناب پرویز کے مضامین جن کا ذکر اوپر آچکا ہے درحقیقت ان کے تدبر فی القرآن کے منتشر اجزاء تھے ان کے اس تدبر کی مستقل صورت وہ عظیم القدر کتاب ہے جو معارف القرآن کے نام سے وجہ فروغ البصار ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کا فخر طلوع اسلام

کو حاصل تھا جو سنہ ۱۹۴۲ء میں مشہور ہوئی اس کے بعد اس مبسوط اور اہم تصنیف کی دو جلدیں اور شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف کسی دوسری فرصت میں کیا جائیگا اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کی صحیح تعلیم کو سمجھنے کے لئے دنیا کی کسی زبان میں اس کتاب کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہمیں جناب پرویز کی کرم گستری سے امید ہے کہ اس سلسلہ کی بقایا کڑیوں کی اشاعت کا فخر ادارۂ طلوع اسلام کو ارزانی فرمایا جائے گا۔

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ حسن من حسن
بہ خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

یہ طلوع اسلام کا حصۂ نثر تھا۔ حصۂ نظم میں بھی اللہ تعالےٰ نے اس کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کا انتظام کر دیا اور اس طرح اس کی تہی دامنی کی لاج رکھ لی۔ طلوع اسلام، پیام اقبالؒ کے نشر و اشاعت کا ذریعہ تھا۔ اس پیام حیات آور کو نظم کے حسین پیکر میں پیش کرنے کا شرف مبداء فیض نے جناب اسدؔ ملتانی کے لئے مقدر کر رکھا تھا۔ اور جناب اسدؔ کی گہرباریوں کو طلوع اسلام کے لئے وقف۔ جناب اسدؔ کی شاعری میں جوش و امید اور بصیرت و ایقان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ طلوع اسلام اپنی خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کا کوئی شمارہ بھی جناب اسدؔ کی فیض بخشیوں سے محروم نہ رہا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

گذشتہ اوراق میں ان احوال و کوائف کا اجمالی سا تذکرہ آپ کے سامنے آ گیا جو سنہ ۱۹۳۸ء سے اوائل سنہ ۱۹۴۲ء تک مسلمانان ہندوستان کی بساط سیاست پر رونما ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی، ان مساعی کا مختصر سا تعارف بھی ہو گیا جو اس باب میں طلوع اسلام کی طرف سے وجود کوشش ہوئیں۔ جون سنہ ۱۹۴۲ء کے بعد طلوع اسلام کی اشاعت میں التوا ہو گیا۔ اس کے بعد، اس وقت تک جو ایسے اہم واقعات و حوادث ملک میں رونما ہوئے جن سے ملت اسلامیہ کی سیاسی زندگی بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئی۔ ان کا

اجمالی سا تذکرہ آئندہ اوراق میں آپ کے سامنے آجائے گا۔ اور اس طرح آپ کے سیاسی فکر میں تسلسل قائم ہو جائے گا جو مستقبل کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

جون سنہ ۱۹۴۲ء کے بعد

سابقہ عنوان میں آپ ان منازل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال چکے ہیں جو سنہ ۱۹۳۸ء سے وسط سنہ ۱۹۴۲ء تک مسلمانانِ ہند کے کاروانِ ملّی نے طے کیں۔ جون سنہ ۱۹۴۲ء میں طلوعِ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ ملتوی ہوا۔ اس کے بعد آج تک ملک میں جو اہم واقعات رونما ہوئے ان کی ایک جھلک دیکھنا بھی ضروری ہے تاکہ قارئین کے ذہنی ربط میں کہیں خلا نہ رہے اور وہ تسلسلِ فکر سے آئندہ ہمارے ساتھ چل سکیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جنگِ عالمگیر ثانی نازک ترین دور میں داخل ہو چکی تھی۔ جرمنی کاکیشیا کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا ایران تک آ پہنچا تھا اور جاپان برما اور آسام کی سرحد پر پر تول رہا تھا۔ ہند شمال مشرق و مغرب سے خطرہ میں تھا کہ اس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جنگ کے اختتام کے بعد ہندوستان کو خود مختاری دے دی جائے گی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کو

کرپس تجاویز

سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا گیا۔ تاکہ وہ ان کی بنا پر مساعی جنگ میں ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔ تجاویز کرپس میں پہلی بار پاکستان کا اصولاً تسلیم کیا گیا۔ ان میں وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں دفاع کے سوا تمام محکمے ہندوستانیوں کو دینے کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی یونین میں شرکت کے دس سال بعد کوئی صوبہ یونین سے علیحدہ ہو سکتا ہے اور یہ علیحدہ شدہ صوبے اپنا الگ وفاق بنا سکتے ہیں۔

کانگریس نے کرپس تجاویز کو محض اس لئے رد کر دیا کہ اس میں پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مسلم لیگ بھی انہیں منظور نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ ان میں مسلمانوں کی علیحدہ ہستی اور ان کے حق خود ارادیت کو غیر مبہم طور پر منظور نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا کم سے کم مطالبہ پاکستان تھا۔ جس سے

کم تر کوئی چیز انھیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ان تجاویز کو نامنظور کر دیا۔

ہندو راج مسلط کرنے کی آخری کوشش

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برِ اعظم ہند کی سیاسیات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جنگِ عالمگیر جس کا آغاز ڈینزگ سے ہوا تھا کرۂ ارض کے زیادہ سے زیادہ رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور اس کی تباہ کاریوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ جرمنی مغربی یورپ کو تقریباً مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ فرانس کی عظیم الشان سلطنت پامال ہو چکی تھی۔ جرمن افواج روس میں فاتحانہ یلغار کر رہی تھیں۔ بلقان بیشتر تاخت و تاراج ہو چکا تھا۔ جاپان غیر معمولی اور غیر متوقع برق رفتاری سے برطانیہ کے "ناقابلِ تسخیر" بحری قلعہ سنگاپور کو سر کر کے اور برما اور جزائر انڈیمان پر قبضہ کر کے ہندوستان کے مشرقی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ جاپانی بمبار طیارے وزیگاپٹم اور کوکناڈا پر بم برسا کر جنگ ہندوستانی سرحدوں کے اندر لے آئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے سابق صدر سوبھاش چندر بوس پُراسرار طریق پر غائب ہو کر جاپانی اسلحہ و تنظیم کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ ہر محاذ پر انگریزوں کی پسپائی اور ہر معرکے میں ان کی شکست سے ہندوستانی عوام کا اعتماد متزلزل ہو چکا تھا۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ برطانوی سلطنت کا ستارہ اب زوال پر ہے اور اس کے زندہ رہنے کے کوئی آثار نہیں۔

اس صورتِ حالات سے انڈین کانگرس نے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ کانگرس نے اس موقع کو نہایت غنیمت سمجھا۔ اس سے پیشتر وہ (غیر مخلصانہ طور پر ہی) مسلمانوں سے اتحاد ضروری سمجھتی تھی۔ لیکن اب اُسے اپنی کامیابی کا اس قدر پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ مسلمان مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنا سیاسی موقف پاکستان کی صورت میں متعین کر چکے تھے۔ ۱۹۴۲ء تک پاکستان مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ مسلمانوں کو یقین ہو چکا تھا کہ آزاد ہندوستان کے کانگرسی خاکے میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ پاکستان اور مسلم لیگ کا دعویٰ نمائندگی دلائل کے مرحلے سے گزر کر زندہ حقیقت بن چکے تھے۔ مسلم لیگ عملی طور پر دس کروڑ اسلامیانِ ہند کی قومی پارلیمان اور ان کی

لی آرزوؤں کی آئینہ دار بن چکی تھی۔

کانگرس نے اپنی متوقع کامیابی کے نشے میں اندھے ہو کر مسلمانوں کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا۔ کانگرس کے کمیونسٹ ارکان نے اسے اپنی غلطی اور مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کی ضرورت کا احساس کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ہندو راج کے تصور نے کانگرس کے اعلیٰ قائدین کو مبہوت کر دیا۔ مطالبۂ پاکستان کی منطق کے سامنے کانگرس مجلسِ عاملہ کے ممتاز ترین رکن راجگوپال اچاریہ کو بھی اعترافِ حقیقت کرنا پڑا اور انھوں نے کانگرس پر زور دیا کہ پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن کانگرس کمیٹی نے الہ آباد میں جلسہ کر کے جگت نرائن کی یہ تجویز منظور کر لی۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی رائے ہے کہ ہندوستان کی کسی جزوی مملکت یا علاقہ واری وحدت کو ہندوستان کی یونین یا وفاق سے الگ ہو جانے کی اجازت دے کر ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی ہر تجویز ملک کے بہترین مفاد کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوگی۔ اس لئے کانگرس ایسی کسی تجویز پر مفاہمت نہیں کر سکتی۔

گویا جو چیز مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھی۔ کانگرس کو اسے بنائے گفتگو تسلیم کرنے سے بھی انکار تھا۔ اس نامعقول تجویز کی منظوری کے خلاف احتجاج کے طور پر راجگوپال اچاریہ اور بعد میں کمیونسٹوں کو بھی کانگرس سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگرس کمیٹی کے ایک اجلاس میں انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ "ہندوستان چھوڑ دے"۔ کانگرس کا اصرار تھا کہ جنگ اور اس کے بعد آزاد ہندوستان کی تمام ذمہ داری اسی کو سپرد کر دی جائے اور جب اس نے دیکھا کہ برطانوی حکومت دس کروڑ کی عظیم مسلم قوم کو نظر انداز کر کے اس کا یہ غیر منطقی مطالبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں، تو مسٹر گاندھی کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ جس وقت مناسب سمجھیں "ہندوستان چھوڑ جاؤ" کے مطالبے کی بناء پر "عام بغاوت" شروع کر دیں۔ چنانچہ عدم تشدد کے اس دیوتا کی قیادت میں ایک سراپا متشددانہ تحریک شروع کر دی گئی اور لندن کی بمباری پر آنسو بہانے والے "مہاتما" کے پیروکاروں نے فساد و خونریزی کا آغاز کر دیا۔ ریل کی پٹڑیاں اکھیڑ دی گئیں۔ گاڑیاں الٹ گئیں۔ ڈاکخانوں، تار گھروں، ریلوے سٹیشنوں، بجلی گھروں اور مفادِ عامہ کے دوسرے مرکزوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ سرکاری دفتروں پر حملے کئے گئے۔ انگریزوں کو قتل کیا گیا۔ بعض جگہوں پر

انسانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

اِس تمام تر کاروائی کا مقصد صرف یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو اس مشکل وقت میں اور پریشان کیا جا سکے تاکہ وہ مرعوب ہو کر اپنی عافیت کی خاطر ہندوستان کے تمام اختیارات کانگریس کے حوالے کر دے

مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خلاف شدید شکایات تھیں جن کی بنا پر انہوں نے جنگی کاروائیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان اس حقیقت کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے کہ اگر جنگ اس برِاعظم کی حدود میں داخل ہو گئی تو اس کی براہِ راست زد مشرقی و مغربی پاکستان پر پڑے گی جس کی آزادی کے لئے وہ سرگرمِ عمل تھے۔ وہ کانگریس کی طرح اس جنگ کو غیروں کی جنگ سمجھ کر بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ایک حاشیہ بردار کی حیثیت سے شریکِ جنگ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ نے جنگی کاروائیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ اس نازک وقت میں حکومت کو پریشان کر کے پاکستان کی سرحدوں کو معرضِ خطر میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

اس کے علاوہ مسلمان بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کی تحریک (یا بغاوت؟) انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ کانگریس تخویف و ترہیب سے اپنا سیاسی تغلب سارے ہندوستان پر مسلط کرنا چاہتی تھی۔ کانگریس کی تحریک کی براہِ راست زد مسلمانوں پر پڑتی تھی اس لئے وہ من حیث القوم اس تحریک سے علیحدہ رہے۔

کانگریس کا "دوسرا محاذ"

کانگریس مجلس عاملہ کے تمام ارکان بمعہ مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن کانگریس کے کچھ لیڈر جیلوں سے باہر رہے۔ ان میں راجگوپال اچاریہ، بھولا بھائی ڈیسائی، کے ایم منشی، ڈاکٹر خان قابلِ ذکر ہیں۔ ان کانگریسی لیڈروں اور سر تیج بہادر سپرو کی قماش کے "غیر جانبدار" ہندوؤں کے سپرد "دوسرا محاذ" تھا۔ ان لوگوں نے باہر رہ کر کانگریس تحریک سے ہمدردی، مسلم لیگ کی مخالفت اور مطالبۂ پاکستان کا استخفاف جاری رکھا۔ ان کی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کا کام ہندو پریس نے سرانجام دیا۔ جس کا برِاعظم بھر میں وسیع جال بچھا ہوا تھا۔

حکومت کی جوابی تشددانہ کاروائی اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے کامل عدم تعاون سے

یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی اور یہ ہنگامہ چند روز میں فرو ہوگیا۔

مسلمانانِ بنگال کے مصائب

۱۹۴۲ء کا سال مسلمانانِ بنگال کے لئے ایک دورِ ابتلا رہا کانگرس کو ہر موقع اور ہر جگہ ایسے نام نہاد مسلمان بآسانی مل جاتے رہے ہیں جن سے ملتِ اسلام میں انتشار پیدا کرنے اور مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کی خدمت لی جاتی رہی ہے ۲۱ جولائی ۱۹۴۱ء کو لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے ایک قومی دفاعی کونسل قائم کی جس میں مسلم لیگ سے بالا بالا سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم پنجاب، مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال، سعد اللہ خاں وزیر اعظم آسام اور دوسرے ممتاز مسلم لیگیوں کو شامل کرلیا۔ قائدِ اعظم نے اس نامزدگی کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی توہین سمجھتے ہوئے دفاعی کونسل کے ان شرکا سے مستعفی ہوجانے کا مطالبہ کیا۔ سکندر حیات خاں اور سعد اللہ خان جھک گئے۔ لیکن مولوی فضل الحق اکڑ گئے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کردی۔ لیگ نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اور اُن کی وزارت سے تعاون چھوڑ دیا۔ مولوی فضل الحق نے بدترین مہاسبھائیوں سے رشتہ جوڑ کے بنگال کے مسلمانوں کو خوب دبایا۔ مولوی صاحب نے متوازی لیگ قائم کرنے اور جناح کی قیادت ختم کردینے کی خاطر ہر وہ حرکت کی۔ جو ان جیسا مغلوب جذبات شخص کرسکتا تھا۔ بنگالی مسلمانوں کو مسلم لیگ اور قائدِ اعظم سے وفاداری کی پوری سزا دی گئی۔ آخر ۔۔لماہ کے طویل دورِ ابتلا کے بعد اپریل ۱۹۴۳ء میں فضل الحق وزارت کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کی سیاسی موت بھی واقع ہوئی۔

"ڈان" کا اجرا

۱۹۴۲ء کے اواخر کا ایک قابلِ ذکر واقعہ انگریزی روزنامہ "ڈان" کا اجراء ہے مسلمانانِ ہند کو اپنی سیاسی زندگی میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ایک بڑی مشکل پریس کی کمزوری تھی۔ اردو روزنامے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اور وہ اپنی بساط کے مطابق خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن ان کے حلقے محدود تھے اور ترقی یافتہ سرمایہ دار منظم ہندو انگریزی پریس کے مقابلے میں ان کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ مسلمانوں کے جو انگریزی روزنامے یا ہفتہ وار اخبارات چل رہے تھے۔ ان کی حیثیت بالکل مقامی تھی۔ ان میں دہلی کا ہفتہ وار "ڈان" بھی شامل تھا۔ اکتوبر میں وقت کی

اہم ترین ضرورت کو پورا کرتے ہوئے "ڈان" کو روزنامہ کر دیا گیا۔ جسے قدرتی طور پر گوناگوں موانعات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سے مسلم قوم کو زبان مل گئی اور مسلمانوں کی آواز برّاعظم کے دوائرِ اعلیٰ اور بیرونِ ہند میں بھی سُنی جانے لگی۔

کانگریسی دام میں لیگ کو پھانسنے کی چالیں

اگست ۱۹۴۲ء کے ہنگامہ سے فضا میں جو ارتعاش پیدا ہوا تھا وہ چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ لیکن گاندھی کے زرخیز دماغ نے کانگریسی تحریک سے از سرِ نو دلچسپی پیدا کر دی۔ چھ ماہ جیل میں گذارنے کے بعد گاندھی نے وائسرائے کو خط لکھا کہ اگر انھیں رہا نہ کیا گیا تو وہ مرن برت شروع کر دیں گے۔ قول و فعل میں اہنسا کے اصول پر عمل کرنے والے گاندھی کا یہ عام حربہ ہے جو وہ اپنی ان ہونی بات بجبر منوانے کے لئے اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔

دوسرے محاذ کے ہندو راہنماؤں نے سر سپرو کی قیادت میں دہلی میں **ایک کانفرنس منعقد** کی تاکہ **گاندھی** کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ قائداعظم کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ اگست ۱۹۴۲ء کی تحریکِ حکومت سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اس لئے جب تک مسٹر گاندھی اس تحریک سے دستبرداری کا اعلان نہ کریں مسلم لیگ ان کی رہائی کی مساعی میں شریک نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک اصولی چیز تھی جس پر مسلم لیگ آخر تک قائم رہی۔ اور اس کے سوا اس کے لئے کوئی اور راہِ عمل بھی نہ تھی۔ لیگ کی اس اصول پرستی پر اس کے خلاف کذب و افترا کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔

اپریل ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جس میں قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسٹر گاندھی کی عیارانہ حرکات کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ (گاندھی) بار بار وائسرائے کو لکھتے ہیں۔ اگر ان کی ذہنیت میں واقعی تبدیلی آچکی ہے تو وہ براہِ راست مجھے کیوں نہیں لکھتے؟ قائداعظم نے فرمایا کہ اگر مسٹر گاندھی اس قسم کی کوئی چٹھی لکھیں تو حکومت اسے روک نہیں سکے گی اور اگر وہ روکے گی تو یہ ایک سنگین بات ہو گی۔

قائداعظم کو بدنام کرنے کے لئے مسٹر گاندھی کو ایک عمدہ موقع ہاتھ آگیا انھوں نے جھٹ قائداعظم کے

نام ایک خط لکھدیا کہ وہ اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔ حکومت میشتر ازیں متعدد بار جیل میں مسٹر گاندھی کے ساتھ ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر چکی تھی لہذا اس نے یہ خط قائدِ اعظم تک نہ جانے دیا۔ اب قائدِ اعظم سے اجلاس لیگ میں اپنی تقریر کی روشنی میں یہ توقع کی گئی کہ وہ حکومت کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کریں۔

اس چال سے مقصود مسلم لیگ کو حکومت سے متصادم کرنا تھا تاکہ مسلمان کانگرس کی دلدل میں پھنس کر اپنے موقف سے دور ہٹ جائیں۔ حالانکہ مسلم لیگ کے لئے حکومت کے ساتھ متصادم ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ قائدِ اعظم کے لئے احتجاج کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ انھیں گاندھی کی چٹھی یا ان سے ملاقات کا شوق نہ تھا بلکہ وہ بلند اور وسیع مقاصد کی خاطر گاندھی کو تبدیلیٔ قلب کی دعوت دے رہے تھے۔ اور انھوں نے اس امر کی وضاحت اپنی تقریر میں بھی کردی تھی کہ اگر مسٹر گاندھی میں واقعی تبدیلیٔ قلب پیدا ہو چکی ہے تو وہ اس قسم کی چٹھی لکھیں۔ چنانچہ سارے طوفان کے جواب میں قائدِ اعظم نے ایک ہی بات کہی "تبدیلیٔ قلب کہاں ہے؟" قلب کی تبدیلی مفقود تھی۔ لہذا قائدِ اعظم نے کانگرس کے دام میں پھنسنے اور گاندھی کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دیا۔

اس باب میں ایک ایسا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کے تذکرہ سے ہماری روح کو دہری اذیت پہنچتی ہے تحریکِ خاکساراں کے متعلق طلوعِ اسلام کی روش ہر اُس شخص کے سامنے ہے جس نے اس کی نشأۃِ اولیٰ میں اس کا کبھی مطالعہ کیا ہو۔ طلوعِ اسلام کو اس تحریک سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ہماری بدقسمتی سے بعد میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ یہ تحریک ہماری جانفزا آرزؤں کا مدفن بن کر رہ گئی۔ زیرِ نظر واقعہ بھی اسی تاسف انگیز حقیقت کا چہرہ کشا ہے۔ مسٹر گاندھی کی مذکورہ صدر چال سے متاثر ہو کر علامہ مشرقی نے اپنے خاکساروں کو حکم دیا کہ قائدِ اعظم کو خطوط اور تار روانہ کریں کہ وہ مسٹر گاندھی سے ضرور ملیں۔ اِدھر یہ اصرار اور دوسری طرف سے قائدِ اعظم کے اُس مسلک سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ایسی فضا پیدا ہوگئی جس سے بعض خاکسار اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور انہی میں سے ایک نے ۲۶ رجولائی ۱۹۴۳ء کو بمبئی میں قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ اس حادثہ سے اسلامیانِ ہند میں غم و غصہ

کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن قائدِ اعظم نے انھیں ضبط و تحمل کی ہدایت کی۔ مسلمانوں نے "یومِ تشکر" منایا کہ ان کی ایک اہم مصیبت اللہ تعالیٰ نے ٹال دی ہے ورنہ جنگِ پاکستان کے انتہائی عروج میں قائدِ اعظم کی غیر حاضری ایک عظیم ترین ملی سانحہ ہوتی جس کے صدمے سے ملتِ اسلام شاید جانبر نہ ہو سکتی۔

اس المناک واقعہ کے بعد مسلم لیگ اور خاکساروں میں خلیج حائل ہو گئی اور مسلم لیگ کو بالآخر اپنے دروازے خاکساروں پر بند کرنے پڑے تاکہ ملت ان غلط اندیشیوں سے محفوظ رہ سکے۔

خضرِ پنجاب

سنہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے احیائے نو کے بعد پنجاب میں کسی وقت بھی لیگ ایک زندہ جماعت نہیں بن سکی تھی۔ پنجاب مسلم لیگ کے قائد سکندر حیات خاں تھے۔ جو اتحاد پارٹی کو لیگ پر مقدم سمجھتے تھے۔ لیگ کی ہاؤ ہو شہروں تک محدود تھی لیکن جس حد تک جماعتی تنظیم کا تعلق ہے وہ مفقود تھی۔ پنجاب لیگ کے اربابِ اختیار نے تنظیم کی کوئی حقیقی کوشش نہ کی اور باعمل اور فعال مسلمان کارکن پنجاب لیگ کے خاکے سے عملی طور پر غائب تھے۔ اس افسوسناک کوتاہی کے خلاف پنجاب کا حساس طبقہ برہم تھا۔ لیکن ان کی آواز دوائر لیگ میں سنی نہیں جاتی تھی۔ مسلم لیگ ابھی اس قدر قوی نہ تھی کہ وہ پنجاب کے قائدین سے ٹکرا سکے یا اُن سے سختی سے باز پرس ہی کر سکے۔

سکندر حیات خاں کی ناگہانی موت کے بعد ان کے جانشین ملک خضر حیات خاں کے ہاتھوں لیگ کی اور مٹی پلید ہوئی۔ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں لیگ کونسل کے اجلاس میں پنجاب کی قیادت کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ جس کے جواب میں ملک خضر حیات خاں نے وعدہ کیا کہ وہ صوبے میں لیگ کو ایک زندہ جماعت بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اگلے ماہ میں لیگ کے سالانہ کھلے اجلاس میں انھوں نے اپنے اس وعدے کو پھر دُہرایا۔ لیکن ملک صاحب اس وعدے کو کسی وقت بھی پورا نہ کر سکے۔ قائدِ اعظم نے ملک صاحب کے وعدے پر انھیں کچھ عرصہ تک مہلت دی لیکن جب صورتِ حالات میں کوئی اصلاح نہ کی گئی تو آخر اپریل سنہ ۱۹۴۴ء میں قائدِ اعظم نے خضر حیات خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی دورخی پالیسی کو ترک کر دیں۔ اسمبلی میں باقاعدہ مسلم لیگ پارٹی قائم کریں اور پنجاب وزارت

کا نام مسلم لیگ وزارت رکھیں۔

قائداعظم کے ساتھ کچھ روز مذاکرات کے بعد خضر حیات خاں نے اپنے غیر مسلم رفقاء اور گورنر گلینسی کے اشارے پر لیگ سے بغاوت کر دی اور قائداعظم کے مطالبے کے جواب میں یہ عجیب و غریب پوزیشن اختیار کی کہ وہ آل انڈیا معاملات میں لیگ کی تائید کریں گے لیکن صوبائی معاملات میں "بیرونی مداخلت" برداشت نہیں کریں گے۔ خضر حیات خاں نے اواخر اپریل میں اپنے طرزِ عمل کے جواز میں چند ایک بیانات دیئے اور اس کے ساتھ ہی سردار شوکت حیات خاں کو ایک عیسائی معلمہ کے معاملہ میں ایک مبینہ بے انصافی کی بنا پر وزارت سے برخاست کرا دیا۔ سردار شوکت حیات خاں کو اپنے والد سکندر حیات خاں مرحوم کی وفات کے بعد، فوجی ملازمت سے مستعفی کرا کر وزیر بنایا گیا تھا اور ایک خصوصی ہنگامی قانون کے ذریعے انھیں ووٹر بنا کر اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔ انھوں نے خضر جناح مذاکرات کے دوران میں لیگ اور قائداعظم سے غیر مشروط وفاداری کا اظہار کیا اور یہی جرم تھا جس پر انھیں وزارت سے علیحدہ ہونا پڑا۔

مسلمانانِ پنجاب میں زندگی کی لہر

اپریل ۱۹۴۴ء کے اواخر میں سیالکوٹ میں پنجاب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ نامساعد حالات کی بنا پر یہ اجلاس دوبارہ ملتوی ہو چکا تھا لیکن خضر حیات خاں کی غداری اور شوکت حیات خاں کی برطرفی نے مسلمانانِ پنجاب کو غیر معمولی جوش سے بھر دیا۔ اس غیر معمولی جوش کا مظاہرہ سیالکوٹ میں کیا گیا۔ دراصل یہی دو امور سیالکوٹ کانفرنس کی کامیابی کا موجب بنے۔

خضر حیات کی قیادت کے خلاف اب کھلی بغاوت ہو گئی اور اسمبلی میں پہلی بار مسلم لیگ پارٹی وجود میں آئی۔ وزارتی پارٹی سے کئی ایک اہم ارکان مستعفی ہو کر مسلم لیگ پارٹی میں آ گئے۔ مسلم لیگ پارٹی کے ان ارکان نے جن کی تعداد ۲۳ تھی، سیالکوٹ کانفرنس میں شرکت کی۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں مذاکرات کی رفتار اور ملک خضر حیات کے طرزِ عمل پر ایک حقائق پرور تقریر ارشاد فرمائی۔

سیالکوٹ کانفرنس سے مسلمانانِ پنجاب کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مسلمانانِ پنجاب خضر حیات کے اس "احسان" کو بھول نہیں سکتے کہ انھوں نے ملت سے غداری کر کے قوم کو بیدار کر دیا۔

ورنہ پنجاب میں لیگ کبھی بھی ایک زندہ اور عوامی جماعت نہ بن سکتی۔ پنجاب لیگ کے نوجوان قائدین افتخار حسین خاں ممدوٹ، سردار شوکت حیات خاں اور میاں ممتاز دولتانہ نے صوبے کے طول و عرض کا دورہ کرکے لیگ اور پاکستان کا پیغام دور دور تک پہنچایا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں پنجاب میں لیگ کا دور دور تک شہرہ ہوگیا۔ حزب مخالف میں رہ کر لیگی قائدین نے شب و روز کام کیا۔ خضر حیات خاں کی بعد کی مزید حماقتوں نے لیگ کو مقبول عام جماعت بنانے میں اور مدد دی۔ اس مقبولیت کا عدیم النظیر مظاہرہ مسلمانانِ پنجاب نے انتخاباتِ عمومی میں کیا۔

لیگ کانگرس مفاہمت کی مساعی

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ راجگوپال اچاریہ اصول پاکستان تسلیم کر لینے کے حق میں تھے۔ وہ اس حقیقت کو بھانپ چکے تھے کہ مسلمانوں کے مطالبۂ خود ارادیت کو اب ٹالا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے کانگرس سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی لیکن انھیں ناکامی ہوئی اور انھیں مجلس عاملہ سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک تجویز پیش کی جو راجہ فارمولا کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی "قطعی" اکثریت کے علاقوں کی علیحدگی کا اصول تو تسلیم کر لیا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے جو طریق کار پیش کیا وہ مبہم تھا۔ اس ابہام کے علاوہ فارمولا کی ابتدائی شرط یہ تھی کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کی تائید و توثیق کریگی۔ یہ ایک شر انگیز شرط تھی جس سے مقصود دنیا پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب تک مسلم لیگ مطالبۂ آزادی کی مخالف رہی ہے۔ راجہ فارمولا میں حق علیحدگی صرف "علاقوں" کے لئے تسلیم کیا گیا تھا۔ حالانکہ مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے حق خود ارادیت طلب کر رہے تھے۔

۷ / جولائی ۱۹۴۴ء کو لاہور میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائداعظم نے راجہ فارمولا کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ جس تجویز کو "قرارداد پاکستان کا لب لباب" کہا جا رہا ہے وہ مسلم لیگ سے کانگرس کی قائدانہ حیثیت تسلیم کرانے کی عیارانہ کوشش ہے۔

۱۹۴۴ء کے اوائل میں مسٹر گاندھی کو خرابی صحت کی بنا پر غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد انھوں نے حسب عادت حکومت اور مسلم لیگ سے علیحدہ علیحدہ سودا بازی شروع کر دی۔

وائسرائے کے ساتھ نامہ و پیام کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے قائدِ اعظم کے نام ذاتی پیغام میں ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لیاقت علی خاں کے الفاظ میں "مسٹر گاندھی چاہتے تھے کہ لارڈ ویول یہ محسوس کرلیں کہ اگر ان (مسٹر گاندھی) کی پیشکش کا دوستانہ جواب نہ ملا تو وہ مسلم لیگ سے اتحاد کرلیں گے"۔

بہرحال مسلم لیگ اتحاد اور باہمی افہام و تفہیم کی ہر دعوت کو لبیک کہنے کو تیار تھی۔ چنانچہ قائدِ اعظم نے بخوشی مسٹر گاندھی سے ملاقات کرنا منظور فرمالیا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں دونوں ممتاز راہنماؤں میں بمبئی میں مذاکرات شروع ہوئے لیکن حسبِ توقع بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ تمہیدی ملاقات میں ہی قائدِ اعظم نے محسوس کرلیا کہ مسٹر گاندھی سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر رہے بلکہ وہ غیر جانبدار مبصرین سے اپنی نیک نیتی کا سرٹیفکٹ لینا چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ قائدِ اعظم کو مکمل اختیار دے چکی تھی اور قائدِ اعظم نے ذمہ لیا تھا کہ وہ مسٹر گاندھی سے جو مفاہمت کریں گے مسلم لیگ اور مسلم قوم اس کو تسلیم کرلے گی لیکن مسٹر گاندھی نے اس قسم کی مفاہمت کے متعلق یہ یقین دلانے سے انکار کردیا کہ کانگریس اس کو تسلیم کریگی۔ چونکہ مسٹر گاندھی "انفرادی" حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے، گفتگوئے مصالحت کو جاری رکھنے کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ کیونکہ گاندھی کی "انفرادی" حیثیت کے پیشِ نظر یہ گفتگو محض تضیعِ اوقات تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کی گفتگو اس دل لگی سے کرنا گاندھی ہی کے شایانِ شان رہتی تھی تاہم قائدِ اعظم نے گفتگو جاری رکھی لیکن آخر گفتگو اور خط و کتابت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کا حقِ علیحدگی مسٹر گاندھی کی "زبان پر ہے دل میں نہیں"۔

گاندھی جناح خط و کتابت کی اشاعت پر لاہور کے اخبار "سول" نے ادارتی تبصرہ میں لکھا تھا کہ نظریات کے اختلاف سے قطع نظر خط و کتابت کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف ایک نہایت قابل اور ہوشیار وکیل ہے اور دوسری طرف ایک نالائق اور ناجذ وکیل جو اپنے کیس کو بھی نہیں سمجھتا اور نہ اسے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مذاکراتِ بمبئی اپنے مقاصد میں ناکام رہے لیکن ان سے مسلم لیگ کا زاویۂ نگاہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آگیا اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہوگئی کہ ہندو مسلم پُر پیچ مسئلہ کو کانگریس کس قدر

سنجیدگی اور دیانت سے طے کرنا چاہتی ہے۔ ان مذاکرات سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسٹر گاندھی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان محض سیاسی سودا بازی کی خاطر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ کم سے کم چیز ہے جس پر مسلمان راضی ہو سکتے ہیں۔ مسٹر گاندھی کو یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ قائد اعظم آزادیٔ ہند کے لئے اتنے ہی بیقرار ہیں جتنا کوئی بڑے سے بڑا کانگرسی۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی گئی۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی آنجہانی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری لیاقت علی خاں کے درمیان "لیاقت ڈیسائی فارمولا" طے پایا۔ جس میں پہلی بار کانگرس کی طرف سے عملی طور پر دو قومی نظریہ کی تائید کی گئی۔ اس مفاہمت میں یہ طے کیا گیا کہ مرکز میں مسلم لیگ اور کانگرس کی نمائندگی مساوی ہو گی۔ حالانکہ پیشتر ازیں کانگرس مسلمانوں کو اپنے تناسب آبادی کے مطابق نیابت دینے کی بھی مخالفت کرتی رہی تھی۔ اس فارمولے میں عملی طور پر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ اور کانگرس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا گیا۔

پہلی شملہ کانفرنس

وائسرائے ہند لارڈ ویول اس فارمولے کی روشنی میں آئینی و سیاسی تعطل کو دور کرنے کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے لندن گئے۔ جہاں سے واپسی پر ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو انہوں نے اپنی تجاویز کا اعلان کیا۔ جن میں وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ میں سپہ سالار اعظم کے سوا تمام ارکان ہندوستانی (یا پاکستانی) رکھنے کا اعلان اس اصول پر کیا گیا کہ مجوزہ مجلس انتظامیہ میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی مساوی ہو گی۔

"اعلیٰ ذات کے ہندو" کے الفاظ پر مسٹر گاندھی نے بہت پیچ و تاب کھائے اور اس سلسلے میں انہوں نے وائسرائے کو جو پیہم پیغامات بھیجے۔ ان سے یہ حقیقت پہلے سے کہیں زیادہ آشکارا ہو گئی کہ مسٹر گاندھی اول تا آخر ہندو ہیں اور ہندو کے سوا کچھ نہیں۔ بہرحال ویول تجاویز کے مطابق ۲۵ر جون کو شملہ میں کانفرنس ہوئی۔ اس دوران میں کانگرسی قائدین رہا کئے جا چکے تھے۔ کانفرنس میں اور کانفرنس کے بعد بیرون از مذاکرات میں اہم نزاعی امر یہ تھا کہ مجوزہ مجلس انتظامیہ کے مسلم ارکان کے انتخاب کا حق صرف

مسلم لیگ کو ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ ہے۔ اس مسلمہ حقیقت کو کانگرس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور پانچ مسلم ارکان میں سے دو غیر لیگی (یا بالفاظ صحیح کانگرسی) "مسلمان" ارکان کا مطالبہ کیا۔ کانگرس کے اس مطالبہ کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کا تناسب ایک چوتھائی سے بھی کم کر دیا جائے۔

اس حیثیت کو مسلم لیگ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کانگرس نے اس موقع پر پھر "قوم پرست" مسلمانوں کو حرکت دی۔ وائسرائے نے کانفرنس میں شمولیت کے لئے گاندھی کو تو دعوت دیدی تھی لیکن کانگرس کے نمائشی صدر ابوالکلام آزاد کو بلانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس پر مسٹر گاندھی نے احتجاج کیا اور آخر آزاد صاحب کو بھی دعوت دیدی گئی۔ "مولانا" حسین احمد "مدنی" کانگرس کی امداد کو پہنچے۔ اور انھوں نے کانگرس کے پروردہ عناصر کو جمع کر کے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلم لیگ کے دعویٰ نمائندگی کو چیلنج کیا۔

انگریزوں سے "ہندوستان چھوڑ جاؤ" کا مطالبہ کرنے والے کانگرس لیڈروں سے وزارت کی خاطر ہر وہ حرکت کی جو ان سے سرزد ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کے دعوے کو جھٹلانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے لارڈ ویول کے "خلوص" کی بھی مدح سرائی کی۔ انھیں یقین تھا کہ برطانوی حکومت مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے تمام اختیارات کانگرس کو سپرد کر دے گی۔ قائداعظم نے یکم جولائی ۱۹۴۵ء کو مسٹر گاندھی سے اپیل کی کہ وہ اس کانفرس کے جھیلوں کو چھوڑ کر مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر لیں کیونکہ ویول تجویز محض عارضی چیز ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ مسٹر گاندھی بعد میں پیش آنے والے اہم اور بنیادی مسائل کے حل کے لئے پاکستان تسلیم کر لیں۔ لیکن کانگرس کو سارے ہندوستان کی وزارت کے خواب نظر آرہے تھے اس نے قائداعظم کی اپیل کا جواب دینے کی بجائے مرکزی کابینہ کے لئے اپنے وزراء کی فہرست بھی تیار کر لی۔

اس نازک موقع پر مسلم ہندوستان نے یک زبان ہو کر مسلم لیگ اور قائداعظم پر اعتماد کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی مجلس، طلبہ کی انجمنوں، مسلم خواتین، علمائے کرام، صوفیائے عظام

غرض ہر طبقہ اور ہر خیال کے مسلمانوں نے قائدِ اعظم کو ہزاروں کی تعداد میں روزانہ برقی پیغام بھیجنے شروع کئے اور ان کی نقول وائسرائے اور صدرِ کانگرس کے نام بھی بھیجی گئیں۔ ان میں مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی قیادت پر کامل اعتماد اور "قوم پرست" مسلمانوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا۔

کانگرس کی ضد کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا شملہ کانفرنس نے کئی گمراہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ جوق در جوق مسلم لیگ میں آنا شروع ہو گئے جن میں مرکزی اسمبلی کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر خان عبدالقیوم، میاں افتخار الدین صدر پنجاب کانگرس ملک فیروز خاں نون قابلِ ذکر ہیں یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا۔ کے اس روح پرور مظاہرے کے ساتھ علمائے کرام بھی میدان میں نکل آئے۔ اور پیرانِ عظام نے بھی اس نازک وقت میں قائدِ اعظم کی قیادت میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا اعلان کر دیا علمائے کرام نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں اپنی قوتیں جمعیت العلمائے اسلام کی صورت میں مجتمع کیں۔

قوم کی طرف سے اس حوصلہ افزا جواب پر قائدِ اعظم نے زیادہ یقین کے ساتھ دشمنانِ ملت کو چیلنج کیا کہ اگر انھیں مسلم لیگ کے دعویٰ نمائندگی میں شک ہے تو اسی سوال پر انتخاباتِ عمومی میں مقابلہ کریں۔

شملہ کانفرنس کے دوران میں قائدِ اعظم اور لارڈ ویول میں جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ کانفرنس کی ناکامی کے ساتھ شائع کر دی گئی۔ لیکن صدرِ کانگرس اور لارڈ ویول کی باہمی خط و کتابت کی اشاعت مناسب نہ سمجھی گئی۔ اور قائدِ اعظم کے پیہم اصرار کے باوجود یہ دستاویز آج تک شائع نہیں ہو سکی۔

انتخاباتِ عمومی معرکہ حق و باطل

ادھر ہندوستان میں شملہ کانفرنس کے بعد کا ہنگامہ بپا تھا۔ اُدھر انگلستان میں جنگِ عالمگیر کے بعد پہلے انتخابات میں چرچل کی حکومت کا تختہ اُلٹا جا چکا تھا اور کلیمنٹ ایٹلی کی قیادت میں مزدور حکومت برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ مسلم لیگ کی طرف سے انتخاباتِ عمومی کا مطالبہ زیادہ شدت سے پیش ہونے لگا۔ لیکن کانگرس اس آزمائش کو ٹالنا چاہتی تھی آخر وائسرائے نے نئے انتخابات کا اعلان کر دیا اور اس

سلسلے میں وہ نئی مزدور حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے لندن گئے۔

قائداعظم نے قوم کو آنے والی آزمائش کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ انتخابات ان دو سوالوں پر لڑے جا رہے ہیں:۔

(اول) مسلمان مسلم لیگ کو اپنی نمایندہ جماعت سمجھتے ہیں۔ اور

(دوم) مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی لیکن قائداعظم کو کامیابی کا پورا یقین تھا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو انھوں نے کوئٹہ میں ارشاد فرمایا:۔

ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ ہم کامیاب رہیں گے۔

اس کے مقابلے میں ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جواہر لال نہرو نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

اگر ہم نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا تو ہم اس کی پوری تیاری کریں گے اور جو کوئی ہماری مخالفت کرے گا ہم اسے کچل دیں گے۔ ہم لڑنا جانتے ہیں۔ ہم نے حکومت برطانیہ سے بھی لڑائی کی ہے۔

کانگرس نے مسلم لیگ کا براہِ راست مقابلہ کہیں بھی نہ کیا بلکہ اس نے ہر اُس امیدوار کی حمایت کی جو مسلم لیگ کے مقابلے میں کھڑا ہو۔ سب سے پہلے مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ تیس مسلم نشستوں میں سے کانگرس نے ایک کے لئے بھی اپنا امیدوار کھڑا نہ کیا۔ میدان سے اس فرار کے باوجود کانگرس نے مخالفین لیگ کی پوری امداد کی۔ لیکن حق و باطل کے اس معرکے میں کانگرس اور اس کے حاشیہ برداروں کو منہ کی کھانا پڑی۔ تیس کی تیس نشستوں پر مسلم لیگ نے کانگرس کے پروردہ جمعیۃ العلماء، احرار، خاکسار، مسلم مجلس اور دوسری "قوم پرست" مجالس کے امیدواروں کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ نصف سے زیادہ حریفوں کی ضمانتیں تک ضبط ہوگئیں۔ ایک فریب خوردہ حسین بھائی لال جی نے قائداعظم کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں بلکہ گستاخی کی لیکن ۳۶۰۲ کے مقابلے میں وہ صرف ۱۲۷ ووٹ لے سکا۔ دوسرے حلقے میں اسے صرف ۸۳ ووٹ مل سکے۔

اس طرح مسلم لیگ نے ایک ایسی کامیابی حاصل کی جو آج تک دنیا کی کوئی سیاسی پارٹی

حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن شپرہ چشم اب بھی حقیقت کو نہ دیکھ سکے اور اس فتح مبین کے بعد بھی کانگرس اور اس کے حلیفوں کو یقین نہ آسکا۔ کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے سردار پٹیل نے "میں نہ مانوں" کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلم لیگ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی پر اترا رہی ہے جہاں حق رائے دہندگی محدود تھا۔ صحیح فیصلہ تو صوبائی انتخابات میں ہوگا۔ "تب ہم دیکھیں گے کہ پاکستان کس طرح قائم ہوتا ہے اور مسلم لیگ کس طرح یوم فتح کی تقریب مناتی ہے۔"

اس دوران میں کانگرس کو ایک اور شوشہ ہاتھ آگیا۔ جاپان اتحادی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا اور سوبھاش چندر بوس کی "آزاد ہند فوج" اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ خاتمۂ جنگ تک "آزاد ہند فوج" ایک مذاق معلوم ہوتا تھا لیکن برطانوی حکومت نے بعض ان بوجھی مصلحتوں کی بنا پر اسے غیر ضروری اہمیت دیدی۔ چنانچہ جاپان کی شکست کے بعد پہلی بار دنیا کو یہ یقین کرنا پڑا کہ بوس کی یہ "فوج" ایک ہوا ہے۔ حکومت نے اس کے منتظمین کے خلاف مقدمے چلائے۔ کانگرس شملہ کانفرنس میں پوری طرح بے نقاب ہو چکی تھی، مسلمانوں کا اعتماد تو وہ کب کا کھو چکی تھی۔ ہندو بھی کانگرس کی رجعت قہقری کو ناپسند کرتے تھے۔ ان غیر مطمئن اور مایوس عناصر کو پرچانے کے لئے آزاد ہند فوج کا ڈھونگ کھڑا کر دیا گیا۔ یہ دراصل کانگرس کا انتخابی نعرہ تھا۔ کانگرس کے پروگرام میں ہنگامہ اور شور و شغب کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیگ کے دوسرے حریف اس معاملے میں بالکل بے مایہ تھے۔ ان کے پاس کوئی پروگرام، کوئی نصب العین نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں لیگ کے پاس ایک واضح نصب العین اور ٹھوس پروگرام تھا۔

کانگرس نے خلاف لیگ عناصر کو تھپکی دی؟ مولانا ابوالکلام صدر کانگرس نے اعلان کیا:۔

صوبائی مجالس آئین ساز میں ہم ہر مسلم نشست پر مقابلہ کریں گے اور غیر معمولی کامیابی حاصل کریں گے

"مولانا" نے یہ بھی اعلان کیا کہ جس نشست پر کوئی کانگرسی امیدوار نہیں ہوگا وہاں ہر اس امیدوار کی حمایت کی جائے گی جو مسلم لیگ کے مقابلے میں کھڑا ہوگا۔ چنانچہ کانگرس نے بدترین قسم کے

رجعت پسندوں، ٹوڈیوں اور سرکار پرستوں کی امداد کی تاکہ لیگ کو شکست دی جا سکے۔ قائد اعظم کو "کافرِ اعظم" کہا گیا۔ مسلم لیگ کی "غیر اسلامی" حیثیت کو آشکارا کیا گیا۔ ہر جگہ مسلم لیگ کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ کارکنانِ لیگ کو زیرِ عتاب کیا گیا۔ پنجاب کی "اسلامی" وزارت نے خدا، رسول، مذہب اور قیامت کا نام لینے پر مسلمانوں کو ایک ایک سال قید کی سزا دینا شروع کر دی۔ مسلمانوں سے حمایت لیگ پر انتقام یوں لیا گیا کہ اناج اور دوسری ضروریاتِ زندگی سے ان کو محروم کر دیا گیا۔ لیکن تکفیر، تخویف و تحریص کی ہر کوشش ناکام و نامراد ہوئی اور جب صوبائی انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو دشمنانِ ملت ارشادِ خداوندی کے مطابق غصے سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگے۔

بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں مسلم لیگ نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ آسام میں ۳۴ میں سے ۳۱، بنگال میں ۱۲۳ میں سے ۱۲۲۔ بہار میں ۳۶ میں سے ۳۰، یوپی میں ۶۶ میں سے ۵۵۔ پنجاب میں ۸۶ میں سے ۸۰۔ سندھ میں ۳۵ میں سے ۲۸۔ اور سرحد میں ۳۸ میں ۔۔ ۔۔ اور سی پی میں ۱۴ میں ۱۳ کر ۱۳۵ نشستیں جیتیں۔ انتخابات کے فوراً بعد لیگ کے متعدد مخالف ارکان لیگ میں آ گئے جس سے لیگ کی کامیابی کا فیصدی تناسب اور زیادہ ہو گیا۔

منافقین کے کارنامے

لیگ کی اس عظیم الشان اور فقید المثال کامیابی سے ایوانِ باطل متزلزل ہو گیا۔ اسلامیانِ ہند اس عظیم آزمائش سے سرخرو نکلے۔ اب دشمنانِ ملت نے اپنی تمام تر قوتیں اس امر پر مرکوز کر دیں۔ کہ مسلمانوں کو صوبائی انصرام سے محروم رکھا جائے۔ پنجاب میں یہ "مقدس" "خدمت سرانجام دینے کے لئے" "امام الہند" تشریف لائے۔ انتخابات سے پہلے ملک خضر حیات خاں نے اعلان کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے انتخابات جیت بھی لئے تو وزارت میری ہی بنے گی۔ لوگ ملک صاحب کے اس خیال کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ بظاہر یہ بات مشکل معلوم ہوتی تھی۔ "مولانا" آزاد نے خضر حیات کا یہ خواب درست کر دکھایا۔ انھوں نے ۸۰ ارکان کو نظر انداز کر کے پانچ ارکان کی "پارٹی" کے لیڈر کو کانگریس، اکالی پارٹی اور ختم شدہ اتحاد پارٹی کے لیگ دشمن محاذ کا لیڈر تسلیم کر لیا اور بمواسطۂ عالم گورنمنٹ گلینسی کے ہاتھوں لیگ اقلیتی وزارت اس صوبہ پر

مسلط کرا دی جس کی اکثریت مسلم لیگ پر اعتماد کا اظہار کر چکی تھی۔

سندھ میں بھی کانگریس نے صرف تین ارکان کی "پارٹی" کے لیڈر جی ایم سید کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ تاکہ مسلم لیگ کی واضح اکثریت کو ناکارہ کیا جا سکے۔ لیکن اتفاق سے سندھ کا گورنر ایک آزاد رو اور منصف مزاج شخص تھا جس نے صوبائی حکومت کا حق اصلی حقدار کے سپرد کر دیا۔ بعد میں سندھ نے ان بچے کھچے منافقین کو بھی صوبائی سیاست سے بے دخل کر دیا۔

وزارتی مشن انتخاباتِ عمومی کے ہنگامہ کے فوراً بعد برطانوی مزدور حکومت نے مسئلہ ہند کے تصفیہ کے لئے ایک اہم اقدام کیا۔ وزیر اعظم اٹیلی کے وعدے کے مطابق "ہندوستان کو آزادی کے حصول میں پوری پوری مدد دینے کے لئے" ۲۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لندن سے ایک وزارتی مشن بھیجا گیا۔ جس کے ارکان وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، وزیر تجارت سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیر البحر مسٹر الیگزینڈر تھے۔ وفد بھیجنے سے پیشتر مسٹر اٹیلی نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ اقلیت کو اکثریت کے سیاسی ارتقاء کے راستہ میں روڑا نہیں بننے دیا جائے گا۔ یہ اعلان برطانوی حکومت کے سابقہ اعلانات کے خلاف تھا۔ کانگریس کو اس سے یقین ہو گیا کہ اب مسلم لیگ کو ضرور نظر انداز کر دیا جائیگا اور حکومت کے کل اختیارات کانگریس کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

وزارتی مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ قائد اعظم نے مصالحت کی خاطر محدود مرکز بھی قبول کر لیا۔ لیکن کانگریس اپنی ضد پر اڑی رہی جس سے مذاکراتِ دہلی ناکام رہے۔

ان مذاکرات کے دوران میں دہلی میں مرکزی و صوبائی مجالس مقننہ کے نئے منتخب مسلم لیگ ارکان کی ایک تاریخی کنونشن منعقد ہوئی۔ جس میں اسلامیانِ ہند کے نمائندوں نے ایک بار پھر اپنے اس عقیدے کا واشگاف اعلان کیا کہ مسلمان پاکستان سے کم تر کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے حصولِ پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی کی پیشکش کی۔ اور قائد اعظم نے قوم کے سامنے دو راہیں پیش کیں "پاکستان یا شہادت!"

مذاکرات دہلی کے بعد شملہ میں کانفرنس کی گئی جس میں برطانوی حکومت کے نمائندوں کے

علاوہ مسلم لیگ اور کانگرس کے نمائندوں نے شرکت کی۔ دونوں سیاسی جماعتوں کے نمائندے جب آپس میں کوئی مفاہمت نہ کر سکے تو ۱۶ ارمئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی وفد نے اپنا فیصلہ شائع کیا۔ جس میں مرکز میں فوری طور پر عارضی حکومت کی تشکیل کے علاوہ صوبوں کی گروہ بندی کی تجویز پیش کی گئی۔ گروہ بندی کی تجویز کے مطابق ہندوستان کے صوبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ الف گروہ میں مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، اڑیسہ اور سی پی۔ ب گروہ میں پنجاب، سرحد اور سندھ۔ ج گروہ میں بنگال و آسام شامل کئے گئے۔ یہ گروہ بندی لازمی رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہر صوبے کو اختیار دیا گیا کہ نئے دستور کے ماتحت پہلے انتخاب عمومی کے بعد وہ اپنے گروہ سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ آئندہ دستور کی تشکیل کے لئے مجلسِ دستور ساز کا خاکہ بھی پیش کیا گیا۔

ان سفارشات کے متعلق مسلم لیگ کا ردِ عمل ۵ رجون تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن کانگرس کی طرف سے فوری طور پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ مسٹر گاندھی نے اسے "بہترین تجویز" کہا۔ ایک ہندو نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق جب یہ تجویز نشر ہو رہی تھی تو سننے والے یقین نہیں کر سکتے تھے کہ برطانوی حکومت کی طرف سے اتنی اچھی تجویز پیش ہو سکتی ہے۔ ہندو لیڈروں کو یقین ہو گیا کہ "پاکستان کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا ہے"۔

ہندوؤں کا یہ تمام جوشِ مسرت عارضی ثابت ہوا۔ انھیں اطمینان تھا کہ مسلم لیگ اس تجویز کو رد کر دیگی اور کانگرس بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کی مالک بن جائے گی۔ لیکن ۶ رجون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل نے جب اس تجویز کو یہ کہہ کر منظور کر لینے کا فیصلہ کر لیا کہ اس میں "پاکستان کی بنیاد" موجود ہے تو ہندو دنیا کی تمام خوشی ماتم میں تبدیل ہو گئی۔ اب انھیں اس تجویز میں نقائص و عیوب ہی نظر آنے لگے چنانچہ کانگرس نے صوبوں کی جبری گروہ بندی اور مرکز میں ہندو مسلم مساوات کو قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے ۲۴ ارجون ۱۹۴۶ء کو وزارتی تجاویز کے استرداد کا فیصلہ کر دیا۔ حالانکہ اس سے ایک سال پیشتر کانگرس مساوات کے اصول کو تسلیم کر چکی تھی۔ کانگرس نے استرداد کے فیصلے کو "منظوری" کہنے پر بے جا اصرار کیا۔

برطانوی حکومت کی عہد شکنی

وائسرائے نے ۱۶ رجون ۱۹۴۶ء کو اعلان کیا کہ مرکزی حکومت کی تشکیل ضرور کی جائے گی۔ اگر کوئی سیاسی جماعت اس میں شرکت سے انکار کر دے گی تب بھی دوسرے عناصر کے تعاون سے مرکزی حکومت ضرور بنائی جائے گی۔ اس واضح اعلان کے بعد مرکز میں حکومت کی تشکیل مسلم لیگ کا حق تھا جو وزارتی تجاویز کو تسلیم کر چکی تھی لیکن کانگرس کے استرداد کے ساتھ ہی حکومت نے عارضی حکومت کی تجویز کو معرضِ التوا میں ڈال دینے کا اعلان کر دیا جو وائسرائے کے اعلان کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اس دوران میں کانگرس اور وائسرائے میں درپردہ سودا بازی ہوئی۔ چنانچہ جب عارضی حکومت کی تجویز کو ملتوی کیا گیا تو کانگرسی حلقوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ اگلی دفعہ جب مرکزی حکومت کی تجویز پیش ہوگی تو اس سے عدم تعاون کرنے والی جماعت کانگرس نہیں ہوگی۔ اس دوران میں مسٹر گاندھی اور برطانوی نمائندوں میں خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جس کی تفاصیل آج تک دنیا کو معلوم نہیں ہو سکیں۔

فیصلہ بمبئی

برطانوی حکومت کی اس صریح وعدہ شکنی کے علاوہ جبری گروہ بندی کے متعلق جو وضاحت ذمہ دار وزراء اور وائسرائے نے کانگرس کی غوغا آرائی سے متاثر ہو کر کی، اس سے مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی حکومت کے عزائم پر شبہ ہونے لگا۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ ہندوستان اور انگلستان کے بنیوں نے درپردہ مسلمانانِ ہند کی قسمت کا سودا کر لیا ہے۔ اس درپردہ کارگزاری اور برطانوی حکومت کی بدعہدی نے اسلامی ہند میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور ہر طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر کے نئی صورتِ حالات کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کی جائے۔ کیونکہ اب اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ وزارتی تجاویز کا تمام شور و شر مسلمانوں کو پھانسنے کی ایک عیارانہ چال ہے۔

چنانچہ جولائی ۱۹۴۶ء کے اواخر میں بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔ جس میں متفقہ طور پر وزارتی تجاویز کو مسترد کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس استرداد کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ "آئینیت" کا دور ختم کر کے آزاد و خود مختار پاکستان کے لئے براہِ راست اقدام کیا جائے۔ ایک قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ نے

ارکان سے مطالبہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت کی بددیانتی کے خلاف احتجاج کے طور پر اس کے عطا کردہ خطابات ترک کر دیئے جائیں۔ چنانچہ بڑے بڑے "ٹوڈیوں" اور "سرکار پرستوں" نے ملت کا اشارہ پاتے ہی غلامی کے یہ تمغے انگریزی حکومت کے منہ پر دے مارے اور ایک ہی جھٹکے میں لیگ ایک بہت بڑی لعنت سے پاک ہو گئی۔ کئی ایک حضرات نے سرکاری جاگیریں تک واپس کر دیں۔ اور اس طرح مسلم عوام کے سامنے قربانی و ایثار کی ایک عمدہ مثال پیش کی۔

قوم نے براہ راست اقدام کے فیصلے کا خیر مقدم انتہائی گرمجوشی سے کیا۔ قوم پاکستان کے لئے اس آخری جہاد کے لئے اپنا سب کچھ نثار کرنے کو بے تاب تھی۔ وہ صرف اپنے محبوب قائداعظم کے "بزن" کے حکم کی منتظر تھی۔ قوم کی یک جہتی اور تیاری کا اندازہ کرنے کے لئے قائداعظم نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" (یوم عمل) منانے کا ارشاد کیا۔ تاکہ مسلمان اس روز ہڑتال، جلسوں، جلوسوں اور پُرامن مظاہروں سے اپنی وحدتِ عمل کا ثبوت دیں۔ اس روز اسلامیانِ ہند نے اپنے جوش و خروش اور اس کے ساتھ ضبط و نظم کا بے مثل مظاہرہ کیا۔

سوئے ہوئے شیروں کی یہ انگڑائی دشمنانِ ملت کو کیسے بھا سکتی تھی، ہندوستان بھر میں ہر چھوٹے بڑے قصبے میں "یوم عمل" دھوم دھام سے اور پُرامن طریق پر منایا گیا۔ لیکن کلکتہ میں مسلمان جلوس میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے کہ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے ابتدائی مرحلے میں انھیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ انھوں نے سنبھل کر مدافعانہ کارروائی کی۔ کچھ روز کلکتہ میں وسیع پیمانے پر کشت و خون ہوا۔ ہزاروں بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہزاروں زخمی ہوئے۔ کلکتہ کی فلک بوس عمارتیں خاکستر کر دی گئیں اور یہ خوبصورت شہر درندوں اور وحشیوں کی بستی بن گئی۔

ہند کا یومِ سیاہ

اس تباہ کاری اور ہلاکت آفرینی سے ہندوستان کی عارضی حکومت کا استقبال ہوا، جو کانگرس اور وائسرائے ویول کی ملی بھگت سے مرکز میں مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر ۲ ستمبر کو ترتیب دی گئی۔ انسانی حقوق کے محافظِ اعلیٰ پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت

میں مرتب شدہ حکومت کا پہلا کارنامہ مجاہدین سرحد پر بمباری تھی۔ ہندو سامراج کے عزائم کا یہ پہلا شرمناک مظاہرہ تھا۔

مرکز میں تغلب حاصل کرنے کے بعد کانگرسی وزراء نے تمام محکموں کو مکمل طور پر ہندو بنانے کی مہم پوری جرارت کے ساتھ شروع کر دی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کو یوں پامال ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس موقع پر نواب بھوپال میدان میں نکلے اور لیگ کانگرس مفاہمت کے لئے انھوں نے شب و روز ایک کر دیئے۔ ان کی مساعی سے جناح نہرو ملاقات کا انتظام ہوا۔ لیکن حسب توقع یہ ملاقاتیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں مسٹر گاندھی نے نواب بھوپال کو لکھ کر دیدیا کہ وہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتے ہیں۔ جب مسٹر گاندھی کی یہ دستاویز منظرِ عام پر آئی تو کانگرسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پنڈت نہرو نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اور آخر "ستیہ" کے دیوتا کو یہ کھلا جھوٹ بول کر مخالفت کے اس طوفان کو دبانا پڑا۔ کہ میں نے دستخط کرنے سے پہلے دستاویز کو اچھی طرح پڑھا نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے دستخط کر کے غلطی کی۔ اس کے کچھ روز بعد نواب بھوپال اور مسٹر گاندھی میں کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں جن میں اقوامِ ہند کی قسمت کے فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہی مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ محولہ فوق دستاویز واپس کر دی جائے۔

عارضی حکومت میں لیگ کی شرکت

وائسرائے اور قائد اعظم کے مابین مزید خط و کتابت کے نتیجہ کے طور پر مسلم لیگ نے بلا شرط عارضی حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا۔ تاکہ کانگرسی حکومت کو یک طرفہ کارروائیوں سے روکا جا سکے۔ عارضی حکومت میں شمولیت کے وقت مسلم لیگ نے اقلیت نوازی کا ایک بے مثل مظاہرہ کیا اور اپنے حصے میں سے ایک نشست اچھوت کو دیدی۔ حالانکہ پیشتر ازیں کانگرس اچھوتوں کو مرکزی کابینہ میں جائز نمایندگی دینے سے انکار کر چکی تھی۔

مسلم لیگ کے اس اقدام سے کانگرسی لیڈر بہت سٹ پٹائے اور انھوں نے آئینی حجت بازیوں سے لیگ کو باہر رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مستعفی ہونے کی دھمکی بھی دی لیکن انھیں حکومت کا

چسکا پڑ چکا تھا ، اب وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے ۔ بہر حال عارضی حکومت میں لیگ کی شمولیت کانگرسی عزائم پر ایک ضربِ کاری تھی جس نے کانگرس کا سارا پروگرام درہم برہم کر دیا۔

کانگرس نے مرکز میں بر سرِ اقتدار آتے ہی مجلس دستور ساز کا اجلاس شروع کر دیا اور لیگ کے کامل عدمِ تعاون کے باوجود دستور سازی کی کارروائی جاری رکھی گئی ۔ صوبوں کی گروہ بندی کے متعلق کانگرس کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر لیگ دستور کی ترتیب میں شریک نہیں ہو سکتی تھی ۔ لیگ کے عدمِ تعاون سے مجلس دستور ساز محض ایک مذاق بن چکی تھی اور عارضی حکومت میں لیگ کے تعاون سے پنڈت نہرو کی قیادت ختم ہو چکی تھی ۔

المیہ بہار

کلکتہ میں ہندوؤں کی دراز دستی نے مسلمانوں کو غیظ و غضب سے بھر دیا تھا لیکن اپنے قائد کے حکم کے مطابق وہ پرامن رہے ۔ بنگال کے مشرقی اضلاع میں بعض جوشیلے مسلمانوں نے کچھ انتقامی کارروائی کی ۔ لیکن حکومتِ بنگال کے سخت اقدامات سے یہ بدامنی زیادہ بڑھ نہ سکی ۔ نواکھلی کے اس مقامی واقعہ سے کانگرس نے پورا فائدہ اٹھایا ۔ مسٹر گاندھی نے حکومتِ بنگال کی غیر ضروری مہمان نوازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواکھلی میں جا کر وہاں کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز داستانیں نشر کرنا شروع کیں ۔ صدر کانگرس اچاریہ کرپلانی نے افسانہ تراشی میں اپنے گورو کے بھی کان کتر دیئے ۔

نواکھلی کے متعلق گاندھی ، کرپلانی اور دوسرے (غیر) ذمہ دار کانگرسی راہنماؤں اور اخبارات کے مبالغہ آمیز بیانات نے بہار کے ہندوؤں کو جوشِ انتقام میں اندھا کر دیا ۔ کانگرسی حکومت کی سرپرستی میں پولیس اور فوج کی عملی اور سرگرم امداد سے بے خبر اور نہتے مسلمانوں کی بستیوں کو گھیر کر پچاس ہزار مسلمانوں کو انتہائی سفاکی سے شہید کر دیا گیا ۔ ۱۹۴۶ء کی عید قرباں پر جبکہ مسلمانانِ ہند جانوروں کی قربانی دے کر سنتِ خلیل تازہ کر رہے تھے ، بہار کے مسلمان اپنی جانوں کی قربانی پیش کر رہے تھے مسلمانانِ ہند اس سانحۂ عظیم پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے ۔ ان کا خون اپنے مسلمان بھائیوں کے بہیمانہ قتل پر کھول رہا تھا ۔ لیکن انہوں نے صبر و ضبط سے کام لیا اور پُرامن رہے ۔ وہ مجبور تھے ۔ تاہم انہوں نے

ان مصیبت زدگان اور خانماں برباد بھائیوں کی امداد کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ان سے بن پڑتا تھا۔ قائدِ اعظم کی اپیل پر تھوڑے سے عرصے میں مسلمانوں نے پچاس لاکھ روپے کی رقم خطیر جمع کر لی۔ یہ رقم اس مد کے علاوہ تھی جو گرم کپڑوں، کمبلوں اور دوائیوں کی صورت میں پہنچائی گئی۔ اس کے علاوہ ہزاروں مسلم نوجوانوں نے بہار جاکر عملی طور پر اپنے بدحال بھائیوں کی رضاکارانہ خدمت کی۔ بنگال اور سندھ کے مسلمانوں نے مسلم مہاجرین کو دعوت دے کر "انصار و مہاجرین" کی مواخات کی تجدید کر دی۔

سندھ کی فتح مبین

صوبائی انتخابات کے سلسلے میں ذکر ہو چکا ہے کہ سندھ میں کانگرس نے جی ایم سید کو تھپکی دینا شروع کر دی تھی تاکہ مسلمانوں کی وحدت میں رخنہ پیدا کیا جا سکے۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں سندھ کی مسلم لیگ وزارت ان رخنہ اندازیوں سے ڈانواں ڈول ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حزبِ مخالف اور وزارتی پارٹی کے ارکان کی تعداد اسمبلی میں برابر ہو گئی۔ اس آئینی تعطل کو دور کرنے کے لئے صوبے میں نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلم لیگ کو شکست دینے کے لئے تمام مسلم دشمن قوتیں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس مختصر سے صوبے میں جمع ہو گئیں لیکن تائیدِ ایزدی سے باطل کے بچے کھچے تنکے بھی رائے عامہ کے سیلِ بے پناہ میں بہ نکلے اور مسلم لیگ نے ۳۷ میں سے ۳۵ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔

لندن کانفرنس

بہار کے المیہ اور سندھ کی فتح مبین نے لندن کانفرنس کی راہ ہموار کر دی۔ جس کی تجویز قائدِ اعظم نے پیش کی تھی۔ وزارتی مشن کی تجاویز کے متعلق کانگرس، مسلم لیگ اور حکومتِ برطانیہ میں جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا اس کو رفع کرنے کی آخری کوشش کی گئی اور وزیرِ اعظم برطانیہ کی دعوت پر لندن میں ایک کانفرنس طلب کی گئی۔ جس میں حکومت کے نمائندوں کے علاوہ قائدِ اعظم، لیاقت علی خاں، جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ نے شرکت کی۔ بہار اور سندھ کے واقعات نے حقائق پوری طرح واضح کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کی روشنی میں اور قائدِ اعظم کے بے مثل زورِ استدلال سے حکومت کو مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن کانگرس کی روز افزوں ہٹ سے ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ کی شرکت کی راہ اور دشوار ہو گئی۔ لندن کانفرنس

کے دوران میں پٹیل نے جو زہریلی اور امن سوز تقریریں کیں۔ ان سے مسلمانانِ ہند کے شبہات میں اور اضافہ ہوا اور باہمی مصالحت کے امکانات ختم ہو گئے۔ لندن میں منہ کی کھا کر ہندو کانگرس نے نام نہاد مجلس دستور ساز کا اجلاس طلب کیا۔ لیکن مسلم لیگ اپنے فیصلے کے مطابق اس میں شریک نہیں ہوئی

رائے عامہ کا سیلاب

انتخاباتِ عمومی میں یونینسٹ پارٹی کو شکست فاش دینے کے باوجود مسلمانانِ پنجاب کے مصائب کا خاتمہ نہ ہوا۔ کانگرس، اکالیوں، مسلمان منافقین اور گورنر گلینسی کی ملی بھگت نے مسلمانانِ پنجاب کی شامتِ اعمال خضر حیات کی صورت میں ان پر مسلط کر دی۔ خضر حیات اپنے غیر مسلم وزراء اور گورنر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا۔ جس کے سبب پنجاب میں عملی طور پر کانگرس کی حکومت مسلط ہو گئی۔ حکومت کے ہر شعبے سے مسلمانوں کو کلی طور پر بے دخل کرنے کے بعد کانگرسی حکومت نے مسلمانوں کی جائز سرگرمیوں پر چھاپہ مارنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لئے لاہور کا منٹو پارک استعمال کرنے کی اجازت نہ دی گئی تاکہ اس میدان کی مقدس گھاس جسکو اور گر موشی پیشتر ازیں اپنے اجتماعات میں پامال کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے پاؤں تلے روندی نہ جائے دفعہ ۱۴۴ اور پنجاب پبلک سیفٹی آرڈی ننس اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ ۲۴ رجنوری ۱۹۴۷ء کو یک لخت بلاوجہ صوبہ بھر میں مسلم نیشنل گارڈ کو خلافِ قانون قرار دے کر مسلم لیگ کے تمام ممتاز راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

پنجاب کے مسلمانوں کے لئے حکومت کے یہ اقدامات امتحان بھی تھے اور چیلنج بھی۔ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ لیکن خدشہ یہ تھا کہ اس زبردست آزمائش میں مسلمان کیسے پورے اتریں گے لیکن مسلمان عوام و خواص نے کامل ۳۴ دنوں تک جس عدیم النظیر یکجہتی، ولولۂ عمل اور جوش و خروش سے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا اس کی داد مخالفین بھی دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ غیر فرقہ وارانہ اور غیر متشددانہ تحریک اپنی قسم کی پہلی تحریک تھی۔ جس میں دیہاتی عوام نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ اور کامل ضبط و نظم کے ساتھ۔ اس تحریک کے دوران میں مسلمانوں کو متفرق قسم کے مصائب جھیلنے پڑے۔ حکومت نے تحریک کو ناکام کرنے کی ہر کوشش کی لیکن تحریک کا زور بڑھتا گیا آخر کار حکومت کو رائے عامہ

کی بے پناہ طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور مسلم لیگ کو تمام پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے ہر پنجابی کو شہری حقوق واپس دلا دیئے اور اس طرح وہ ایک کڑی آزمائش سے سرخرو نکلے۔

انھیں دنوں سرحد و آسام کے مسلمانوں کو بھی اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے حکومت سے متصادم ہونا پڑا۔ دونوں صوبوں کی تحریکیں کافی طوالت پکڑ گئیں لیکن مسلمانوں کے عزم و حوصلہ میں کمی واقع نہ ہوئی۔ آخر نئی آئینی تبدیلیوں کے پیشِ نظر یہ تحریکیں بند کرنا پڑیں۔

فسادات پنجاب

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیرِ اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک تمام اختیارات اہالیانِ ہند کے حوالے کر دے گا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو مسلمانانِ پنجاب نے اپنی تحریک کے کامیاب خاتمہ پر یومِ فتح منایا۔ اس کے فوراً بعد خضر وزارت نے استعفیٰ دیدیا۔ مسلمان خوش تھے کہ ان کے مصائب بالآخر ختم ہونے والے ہیں لیکن ہندو اور سکھ لیڈروں کی آتش بار تقریروں نے پنجاب کو بہت جلد جہنم زار بنا دیا۔ ۴ مارچ کو لاہور میں فساد کی آگ بھڑکائی گئی جس نے بڑھتے بڑھتے تقریباً سارے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور ملتان خاص طور پر اس کے شکار ہوئے۔ ہر جگہ فساد کی ابتدا غیر مسلموں نے کی اور مسلمانوں نے اپنی حفاظت کی خاطر جوابی کارروائی کی۔

فسادات کے بعد کا دور مسلمانانِ پنجاب کے لئے ایک دہشت زدگی کا دور تھا۔ مارچ کے بعد پنجاب میں کچھ ماہ کے لئے عملی طور پر سکھا شاہی رہی۔ صوبے کی عنانِ حکومت ایک آمر گورنر جینکنز کے ہاتھ میں تھی جو اپنے سیہ کار پیشرو کا بدتر جانشین ثابت ہوا۔ خضر وزارت کے استعفیٰ کے بعد بھی اس نے مسلم لیگ کو وزارت سازی کا موقع نہ دیا۔ حالانکہ لیگ اسمبلی میں واضح اکثریت کی دعویدار تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ضلع راولپنڈی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں پر مظالم کئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے میں فسادات کے بعد فوج اور سول حکام کی سرپرستی میں جتنا نقصان جان و مال مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ اتنا نقصان فسادات کے دوران میں ہندوؤں اور سکھوں کا نہیں ہو سکا۔ مارچ کے افسوسناک واقعات کے بعد مسلمانوں کو من حیث القوم غنڈہ اور مجرم سمجھ لیا گیا تھا جن کے لئے حکومت کے

قانون میں کوئی پناہ نہ تھی۔ بہرحال راولپنڈی کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک ابتلائے عظیم تھا۔ جسے انھوں نے غیر معمولی صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔

اس کے فوراً بعد گوڑگاؤں کی مسلم اقلیت کو منظم غنڈہ گردی کی آماجگاہ بنایا گیا اور اسی کے ساتھ بھرت پور اور الور کی ریاستوں میں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ یہاں کی مسلم رعایا کو یا تو بالجبر ہندو بنا لیا گیا یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کلکتہ میں بھی غنڈہ گردی معمول بن گئی۔

تقسیم ہند کا اعلان

۳ رجون ۱۹۴۷ء کو ہند کی نئی آئینی تبدیلیوں کے متعلق تاریخی سرکاری اعلان ہوا جس میں تقسیم ہند کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ اس اعلان کو مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں نے تسلیم کرلیا۔ اس اعلان میں بلوچستان، سرحد اور سلہٹ سے اس سوال پر استصواب رائے کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ان تینوں علاقوں کے فیصلے مسلمانوں کے لئے جتنے حوصلہ افزا تھے اتنا ہی دل شکن اس تحدیدی کمیشن کا فیصلہ تھا جو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لئے مقرر کیا گیا تھا اس کے انگریز صدر سر سرل ریڈکلف نے تقسیم اور حد بندی کے تمام مسلمہ اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پنجاب اور بنگال کا مسلم اکثریت کا کثیر علاقہ پاکستان سے چھین کر ہندوستان کو دیدیا۔ مسلمانوں کے لئے ریڈکلف کا فیصلہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا لیکن چونکہ مسلمان راہنما اس کی قبولیت کا وعدہ قبل از وقت کر چکے تھے اس لئے ناچار انھیں یہ تلخ گھونٹ پینا پڑا۔ یہ صریح بے انصافی انگریز ہندو سازش کا نتیجہ تھا جس کے خدوخال حالیہ واقعات نے پوری طرح نمایاں کردیئے ہیں۔

پاکستان زندہ باد!

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو (بروز جمعۃ الوداع) دو نئی مملکتوں ــــ آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان ــــ کا قیام عمل میں آیا۔ اس روز پاکستان و ہندوستان میں صدیوں کی غلامی سے نکلنے کے بعد خوشی کے جشن منائے گئے۔ ۱۸ راگست کو کراچی میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔ ریڈکلف فیصلہ اور پنجاب کے روزافزوں فسادات سے مسلمان افسردہ خاطر ضرور تھے۔ لیکن وہ اس احساس کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ وہ پہلی بار آزاد فضا میں عید منا رہے ہیں۔ اس قسم کا

"پہلا موقع" ہر شخص کی زندگی میں نہیں آیا کرتا۔

مسلمانوں کا قتلِ عام

آزادی کی خوشیوں کا شور ابھی فضا میں گونج رہا تھا کہ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں پٹیالہ، کپورتھلہ، فریدکوٹ، نابھہ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ دہلی سے کراچی آنے والی پاکستانی سپیشل گاڑی پر حملہ کیا گیا اور اس کے بعد ہر سواری گاڑی کو روک کر مسلمان مسافروں کو قتل کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی گئی۔ مسلمانوں کو قبل از وقت غیر مسلح کر دیا گیا۔ ہندو اور سکھ پولیس اور فوج کی سرپرستی میں آزاد ہند فوج اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے سورماؤں نے ہر قسم کے جدید آلاتِ جنگ رائفل، برین گن، مارٹر، ریوالور، بم اور مشین گن کی مدد سے چند دنوں کے اندر ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ زندہ مسلمان یا تو بصد مشکل پاکستان پہنچ گئے یا زبردستی شدھ کر لئے گئے۔ اب مسلمانوں کی کروڑوں روپئے کی جائداد پر ان ظالمین کا غاصبانہ قبضہ ہے۔

مشرقی پنجاب میں اپنی مہم کامیابی کے ساتھ ختم کرنے کے بعد ہلاکت و تباہ کاری کی یہ قوتیں ہندوستانی یونین کے صدر مقام دہلی میں سرگرمِ عمل ہو گئیں۔ وہاں خون آشام کالی دیوی کی پوجا کا جشن منایا گیا۔ اور چند روز میں پچاس ہزار مسلمانوں کو خاک و خون میں لوٹایا گیا۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ بچے کھچے مسلمان انتہائی خستہ حالت میں پاکستان پہنچے۔ دہلی میں مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد ان خون آشام درندوں نے یوپی کا رخ کیا۔ مغربی یوپی سے بھی مسلمانوں کو ختم کر دیا گیا۔

الغرض قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا، تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہنی بال، ہلاکو، چنگیز، نادر وغیرہ کے قتلِ عام اس کے سامنے بے حقیقت ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہمارے سینے ان جگر گداز اور لرزہ خیز واقعات سے فگار ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو ان باقی ماندہ لاکھوں مسلمانوں کی بحالی کا اہم کام درپیش ہے جو اپنی زندگی کی ساری متاع لٹا کر صرف اپنی جان بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔ پاکستان کے جو ذرائع نوزائیدہ مملکت کی ترقی و ترفیع کے لئے صرف ہونے والے تھے اب وہ زخمی دلوں کو مرہم مہیا کرنے کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں۔

جوناگڑھ، کشمیر

پاکستان کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ جوناگڑھ اور مانا ودار کی ریاستوں نے بخوشی پاکستان میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ہندوستانی یونین پاکستان کے علاقے میں اس اضافے کو برداشت نہ کر سکی۔ اور اس نے ان ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت ماضی کی ایک یادگار ریاست حیدرآباد باقی رہ گئی ہے جسے بجبر ہندوستان میں شامل کرنے کی تدابیر ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کا ابتلاء یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ہندوستانی حکومت نے حال ہی میں کشمیر پر جو حملہ کیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے ایک اور بہت بڑی آزمائش ہے۔ کشمیر، پونچھ اور جموں میں ڈوگرہ گردی اپنی پوری ہولناکیوں سے سرگرم عمل ہے جس کے اعمالِ سیاہ کو چھپانے کے لئے ہندوستانی یونین کے ہوائی جہازوں کا سایہ کر دیا گیا ہے۔ اب تک ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اس خطہ جنت نظیر میں موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ مجاہدین کشمیر اپنی آزادی اور سلامتی کے لئے کفن بردوش اور شمشیر بکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ اس وقت کشمیر میں ظلم و انصاف کی ٹکر ہے۔ ظلم کی پشت پناہ فوجیں اور آلاتِ حرب ہیں اور انصاف کی پشت پر مسلمانوں کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کے علاوہ دستِ غیب ہے۔ پاکستان اپنی گوناگوں مشکلات کے سبب اس تصادم کا خاموش تماشائی ہے۔ وہ بوجوہ مجاہدین کی عملی امداد نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کی اخلاقی امداد تمام تر مجاہدین کے ساتھ ہے۔ مسلمانانِ کشمیر نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ کی بشارت پر موت کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی پریشانی

ہندوستان میں دہشت زدہ اور ہراساں مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ اپنی بے بسی و بے چارگی اور حاکموں کی فرعونیت اور دراز دستی نے ان میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستانی حکومت ان سے عجیب و غریب قسم کی وفاداری کی توقع رکھتی ہے۔ ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کے لئے ان کی خودداری اور غیرت کی قیمت طلب کی جاتی ہے۔ ملازمتوں سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور آئندہ کے لئے ان پر تمام راہیں بند کرنے کیلئے ملازمتوں میں نشستوں کی تخصیص اڑا دی گئی ہے۔ جداگانہ حق انتخاب اور تحفظات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے سکولوں کو سرکاری امداد بند کر دی گئی ہے کیونکہ یہ سکول "قومیت متحدہ" کی تشکیل میں حارج ہیں۔ ذبیحہ گاؤ کی قانونی بندش کر دی گئی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو ایک جائز چیز کے استعمال سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ہندی زبان سرکاری و عدالتی زبان قرار دیدی گئی ہے۔ ملازمتوں کے لئے ہندی سیکھنا ضروری ہے مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سے حکومت بری ہو چکی ہے اور انھیں اپنی حفاظت کا خود انتظام کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کو کلی طور پر غیر مسلح کر دیا گیا ہے اور اس طرح انھیں غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان غنڈوں کی گرفت کے لئے کوئی قانون موجود نہیں۔

مسلمانوں کے اس انتشار سے کئی دنیا پرست، موقع شناس اور ابن الوقت اشخاص کو اپنی پامال شدہ قیادت کی دکان پھر چمکانے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی بے بسی و بے چارگی کو اپنے مقاصد مشئومہ کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ابوالکلام آزاد جنہیں سیاسی شدھی کے بعد اپنی "خطا کار" قوم کے قریب آنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی، آج دہلی کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کی زبوں حالی پر طعنہ زنی کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ انھیں لاکھوں مسلمان بھائیوں کے بیدردانہ ذبح ہو جانے کا رنج نہیں بلکہ انھیں خوشی ہے کہ مسلمان ان کی قیادت سے سرتابی کے جرم عظیم میں پٹ رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو استہزا آمیز تبسم سے کہہ رہے ہیں "ہم تمہیں گذشتہ بیس سال سے نہیں کہہ رہے کہ تمہارا یہی حشر ہو گا" "مولانا" کو اطمینان ہے کہ اب وہ کانگرس کے حاکمانہ اقتدار کے بل بوتے پر اپنی پامال شدہ قیادت کو پریشان روزگار مسلمانوں پر تھوپ سکیں گے۔

لیگ کی تقسیم قیادت کی اس ہوس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں سے بنوک شمشیر یہ کہلوایا جا رہا ہے کہ انھوں نے لیگ کا ساتھ دے کر سخت غلطی کی۔ مذہبی بنیادوں پر تنظیم کو جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس انتشار کے پیش نظر آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا ایک اہم اجلاس ۱۴ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ چونکہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان و ہندوستان کی حیثیتوں اور دونوں نئی مملکتوں کے مسلمانوں کے مسائل میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا ہے اس لئے مسلمانوں کی اس اہم سالہ تنظیم کو پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہندوستانی مسلمان بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی ملی پالیسی کی تشکیل کر سکیں۔ اور مسلمانوں کے انتشار سے وہ لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں جو مسلمانوں کے مصائب پر اپنی قیادت کا ایوان تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

اواخر دسمبر میں "مولانا" آزاد نے اپنے ہم خیال مسلمانوں اور چند دہشت زدہ مسلم لیگ راہنماؤں کی ایک کانفرنس کی جس میں مذہبی بنیادوں پر قائم شدہ جماعتوں کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ (یا حکم؟) دیا گیا کہ وہ بلا شرط کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ یہ کانفرنس اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ کیونکہ مسلم لیگ نے بحیثیت جماعت اس کا مقاطعہ کیا۔ ہندوستان کے مسلمان اب بھی مسلم لیگ ہی کو اپنے دکھوں کا علاج سمجھتے ہیں اور ہا کی عدم موجودگی میں "سایۂ بوم" گوارا نہیں کر سکتے۔

(اس مضمون میں تقسیم ہند سے متعلق واقعات کا سلسلہ وار بیان تو آ گیا ہے مگر ان پر تبصرہ نہیں آسکا۔ یوں بھی (کم از کم) واقعات کے پس منظر میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ چونکہ تقسیم سے متعلق مسائل نہایت اہم ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس لئے ان پر علیحدہ مفصل تبصرہ ہم آئندہ پرچوں میں شایع کریں گے)

پس چہ باید کرد!

"کیا یہی وہ پاکستان ہے جس کے لئے دس برس تک ہم نے قربانیاں کیں؟ تباہی و بربادی، مفلسی اور محتاجی، بیکسی اور بیچارگی، ذلت و رسوائی! کیا یہی ہیں آزادی کے ثمرات؟ ساٹھ لاکھ کے قریب مسلمان خانماں خراب، بے گھر، بے در، مارے مارے پھر رہے ہیں، نہ رہنے کو ٹھکانہ، نہ کھانے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا۔ میاں کو بیوی کی خبر نہیں، بیوی کو میاں کا پتہ نہیں۔ ماں کو بچے کا علم نہیں، بچوں کو باپ کی خبر نہیں۔ چھ لاکھ کے قریب مظلوم مسلمان لاپتہ ہیں۔ ان میں سے اکثر سکھ درندوں کی سفاکی کا شکار ہو گئے۔ بوڑھے باپ کے سامنے اس کے بیٹوں کو ذبح کیا گیا، ماؤں کی گود سے معصوم بچوں کو چھین کر انہیں نوکِ شمشیر پر اچھالا گیا، گھروں کے اندر محبوس و محصور بیکسوں کو زندہ آگ میں بھون دیا گیا۔ کچھ راستوں میں سفر کی صعوبت، بھوک اور پیاس کی شدت سے لقمۂ اجل ہو گئے باقی ماندہ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں، جنہیں سانس لینے والی لاشوں کا قبرستان کہنا زیادہ موزوں ہے، ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ اس شدت کی سردی میں انہیں سر چھپانے کے لئے چھت نصیب نہیں، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہیں۔ بڑا کرم کیا تو چوبیس گھنٹے میں تین چھٹانک اناج ان کے سامنے ڈال دیا۔ ننھے ننھے بچے ایک گھونٹ دودھ کے نہ ملنے سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھو، اور اگر غیرت و حمیت کی کوئی رمق بھی اعماقِ قلب باقی ہے تو ڈوب کر مر جاؤ کہ تمہاری قومی ناموس کی امانتدار پچاس ہزار نوجوان لڑکیاں غضب ہو چکی ہیں۔ سنتے ہو یہ کیا قیامت نہیں! کیا یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہوا کہ چند "رہزنانِ ملت" مسانیدِ سلطنت پر متمکن ہو کر اپنے جذبۂ حکمرانی کی تسکین کا سامان

بہم پہنچانا چاہتے تھے۔ لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خونِ ناحق محض اس لئے بہا دیا گیا کہ وہ اِن غارتگرانِ دین و دانش کے ایوانہائے سطوت و اقتدار کی تزئین و آرائش کا ذریعہ بن سکیں ہزاروں عصمتیں برباد ہوگئیں کہ وہ ان سبعیت و بربریت کے پیکروں کی ہوسِ کامرانی و جذبۂ کامجوئی کی قیمت ادا کر سکیں۔

کیا یہی ہیں وہ حکومتِ الٰہیہ کے ایوانِ خاص کے عمائد و اراکین جن کی شیطنت پر انسانیت روتی اور آدمیت آنسو بہاتی ہے؟ جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی، رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد، تملق، اعزہ پروری، احباب نوازی، کیا یہی ہیں وہ خصوصیات جن کی خاطر غیروں کی حکومت پر اپنی حکومت کو ترجیح دی جاتی تھی؟ نااہلی، غلط اندیشی، تساہل انگاری، وعدہ خلافی، کام چوری، ملت فروشی، خود غرضی، خود ستائی، ہوس پرستی، زراندوزی، کیا یہی ہیں وہ معیار جن کی بنا پر اربابِ حکومت و سطوت کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا؟ 'اسلام خطرے میں ہے'، 'ملت تباہ ہو رہی ہے'۔ 'قوم ڈوب رہی ہے' کیا یہ سب نعرے اس لئے لگائے جا رہے تھے کہ ان اکابرین کے اپنے مفاد خطرے میں تھے؟ اسلامی قانون، شریعت کا آئین، قرآنی نظام' کیا یہ سب فریب دہی اس لئے تھی کہ مسلمان کو مذہب کے نام پر لٹوایا جائے اور اس طرح اپنا الو سیدھا کیا جائے؟ سوچو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اور پھر غور کرو کہ کب تک تمہارے ساتھ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ ہم سے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندو نے ہمارے حصے کا اسلحہ روک رکھا ہے، اس نے ہمارا روپیہ دبا رکھا ہے، وہ بے ایمان ہے، وعدہ خلافیاں کرتا ہے، وہ بددیانت ہے، ہمارے خلاف کھلی ہوئی سازشیں کرتا ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ ان سے اسلحہ اور روپیہ لئے بغیر یہاں چلے آنے کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ وعدہ خلافیاں کرتا ہے لیکن کیا اس لئے نہیں کہ وہ جانتا ہے کہ تم اس کا منہ توڑ جواب نہیں دے سکتے؟ اگر تم میں ہندو کے مقابلہ کی ہمت نہ تھی تو پھر ہندوستان کا بٹوارہ کیوں کرایا؟ اگر ہندوستان ایک ہی رہتا، اگر ہم جداگانہ قوم

ذہن میں بٹھائے، تو یہ مصیبتیں ہم پر کیوں آتیں؟ بھاڑ میں جائے یہ آزادی اور چولھے میں پڑے یہ پاکستان! ہم اس سے باز آئے۔ ہندوستان کا مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں ختم ہو جائے گا۔ اور پاکستان کا مسلمان یہاں کے نااہل مدبروں اور بددیانت حاکموں کی ابلہ فریبیوں اور چیرہ دستیوں سے سسک سسک کر مر جائے گا۔ اور اس کے بعد "اسلام کا فروغ" ہوگا، حیرت ہے کہ تمہاری آنکھوں پر کب تک پردے پڑے رہیں گے اور تم کب تک ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے رہو گے؟

یہ ہیں وہ خیالات جو آج کل عام طور پر فضائے پاکستان کو عفریتی بگولوں کی رقص گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر یاس و قنوطیت کے آئینہ دار ہیں جو ناقابلِ برداشت مصائب و آلام سے پیدا ہو چکی ہے۔ کچھ ان موہوم امیدوں کی شکست کی صدائیں ہیں، جو لوگوں نے اپنے دلوں میں خود ہی پیدا کر لیں اور جن کے بروئے کار نہ آنے سے وہ جھنجھلا اٹھے۔ کچھ ایسے نشتروں کی حیثیت لئے رہتے ہیں، جنھیں طبیبِ مشفق زہر آلود ناسور کی جراحت کے لئے بطورِ علاج تجویز کر رہا ہے کچھ ایسے ناقدین کے خندۂ حقارت آمیز پر مبنی ہیں جو لوگوں کی سیاہ بختی کے وقت نہایت تمسخرانہ انداز میں کہا کرتے ہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے؟" ان خیالات کے محرک اسباب و علل کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اس وقت پوری کی پوری قوم کے دماغی توازن اور قلبی سکون کو کھو رکھا ہے اور حالت یہ ہو چکی ہے کہ کہیں یہ آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر تسکین و طمانیت اور ایقان و ایمان کی متاعِ گراں بہا کو بھسم کر رہے ہیں، اور کہیں شعلہ جوالہ کی صورت اپنے گرد و پیش کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے میں مصروفِ عمل ہیں۔ اور ان سب کو ہوا دینے میں ان غدارانِ ملک و ملت کا منافق گروہ پیش پیش ہے۔ جو شروع ہی سے ملت کے عزائم و مقاصد کا دشمن رہا ہے۔ اور جو آج ناصحینِ مشفق کی نگاہ فریب نقاب میں "ففتھ کالم" کی حیثیت اختیار کر کے اپنے آقایانِ نعمت کا حقِ نمک ادا کر رہا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ

(۱) بھک سے اڑ جانے والے جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے تمام حالات کا جائزہ لیا جائے

اور مختلف اسباب و علل کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے، جو جو غلطیاں ہم سے ہوئی ہیں ان کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا جائے اور اس طرح انھیں آئندہ اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۲) اس خطۂ ارض کے تحفظ و استحکام کا پورا پورا سامان کیا جائے۔ جسے انھوں نے اپنی ذرہ نوازیوں کے صدقے ہماری وراثت میں دیا ہے اور جس سے ہمیں ایسی امکانی قدرت حاصل ہوئی ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی تصورات کے مطابق اپنی دنیا کی تشکیل کر لیں۔

(۳) منافقین (قوم پرست مسلمانوں) کے اس طائفہ کو جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا ہے اور اب ناصحینِ مشفق کے لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے۔ جلد از جلد بے نقاب کر کے اپنوں سے الگ کیا جائے۔

(۴) جو نالائق اور بددیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسانید اقتدار پر متمکن ہو چکا ہے اسے اس کی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر اس کے اصلی مقام تک لوٹا دینے کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کو اٹھانے کے اہل ہو جائیں۔

(۵) گذشتہ حوادث و نوازل نے قوم کی اقتصادی حالت کو جس درجہ پست کر دیا ہے اس کا صحیح اندازہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے۔

(۶) اس انقلاب کو جو اس وقت ضمیرِ عوام میں پہلو بدل رہا ہے، صحیح خطوط پر متشکل کر کے ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہ انقلابی روح، صحیح قیادت اور متعین منزل کے فقدان سے تعمیری نتائج مترتب کرنے کی بجائے مزید تخریب و اختلال کا موجب نہ بن جائے۔ اس لئے عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت منزلِ مقصود کی واضح اور غیر مبہم تعیین، اور اس تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم کی روشن نشاندہی کی جائے۔

(۷) اربابِ اقتدار کو بتایا جائے کہ وہ اپنا نصب العین جذبۂ حکومت کی تسکین کی بجائے فرائضِ خدمت کی ادائیگی قرار دیں، اور عوام کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبے کے ساتھ ساتھ اس

اہم حقیقت کو بھی فراموش نہ کردیں، کہ ان کے صرف حقوق ہی نہیں بلکہ کچھ فرائض بھی ہیں اور حقوق و مواجب کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فرائض کو بطریقِ احسن بجالائے۔

(۸) جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کردیا جائے اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہ سکیں گے۔

(۹) اور ان سب مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑا ہم نے حاصل کیا ہے (یا بالفاظِ صحیح ہمیں اس مبدارِ فیض و کرم کی موہبتِ کبریٰ سے عنایت ہوا ہے) وہ غرض بطریقِ انسب پوری ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطۂ ارض میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر فطری غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کرسکے۔ اور اس طرح پھر سے اس آئینِ کہن کو تازہ کردے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

ان حسین آرزوؤں اور مقدس تمناؤں کو لے کر "طلوعِ اسلام" پھر جادہ پیما ہو رہا ہے۔ اس کے پیشِ نظر سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ تمام سعید روحیں جو متذکرہ صدر مقاصد و عزائم میں اس سے ہم نوا ہیں لیکن آج کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بچھڑ اطراف و جوانبِ ملک میں، الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں، انھیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کرکے ایک ذہنی مرکز پر جمع کرلیا جائے اور اس طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے اور وہ اپنے مقامِ محمود پر پہنچ کر آسمان سے کہہ سکے کہ

دیدہ آغازم، انجامم نگر!

خوش بخت ہیں وہ افراد جو اس کہکشانی قافلہ کا ہراول بنیں، اور درخورِ ہزار مبارکباد ہے وہ قافلہ جو ایسے سعادت مند، عزیمت نشان افراد کے اجتماع سے متشکل و مرتب ہو۔ طلوعِ اسلام کو سب سے

پہلے انہی افراد کی تلاش ہے۔ اس کے بعد ان کی مشاورت سے قدم آگے بڑھائے جائیں گے۔ اِنَّمَآ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا (۳۴/۴۶) میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کرکے اٹھ کھڑے ہو، پھر سوچو (کہ تمہیں کیا کرنا ہے)

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے لئے طلوعِ اسلام پھر آپ کے سامنے آرہا ہے۔ طلوعِ اسلام ایک ماہوار مجلہ نہیں بلکہ ایک ادارہ (Institution) ہے۔ ماہوار مجلہ اس ادارہ کی آواز اور اس کی دعوت کا نقیب ہے۔ اگر آپ اس دعوت سے ہم نوا ہیں تو اس کے حلقہ میں شریک ہو جائیے طلوعِ اسلام آپ کے خیالات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنے گا اور آپ کی آواز کے لئے آلۂ مکبر الصوت کا کام دے گا۔ آپ اس دعوت کو عام کرنے کے لئے اپنے اپنے دائرۂ اثر و نفوذ میں کام کیجئے اور اس طرح اس حلقہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیے۔ حتیٰ کہ اس کی لہریں، ایتھر کی موجوں کی طرح قیود ناآشنا اور حدود فراموش ہو جائیں اور قرآن کی یہ آواز پاکستان کی سرزمین سے ابھر کر ساری فضا کی پہنائیوں پر محیط ہو جائے۔ پاکستان ایک ایسے مردِ حق آگاہ کے مقدس خواب کی تعبیر ہے جسے اللہ نے بصیرتِ فرقانی کے نور سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس کی بنیادیں قرآنی تصوراتِ حیات کی محکم چٹان پر قائم ہیں۔ اس لئے ہمارا ایمان ہے کہ یہ بڑھے گا، پھولے گا، پھلے گا اور اس کی شاخیں شرق و غرب کو محیط ہو جائیں گی۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ (اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں تحت الثریٰ میں محکم پیوست ہوں، اور اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں) اور توفیقِ ایزدی یہ اُس نظامِ زندگی کی تربیت گاہ بنے گا جو وجہ بالیدگیٔ شرفِ انسانیت اور باعثِ ارتقائے احترامِ آدمیت ہیں۔

یہ ہیں ہماری آرزوئیں اور یہ ہیں ہمارے عزائم۔ ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین۔

لمعات

حصولِ پاکستان کے بعد ایک تو مشرقی پنجاب وغیرہ کے حوادث کی ناگہانی آفت تھی۔ جس کی طرف سب سے پہلے توجہات مرکوز کرنی ضروری تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا اہم سوال بھی پیشِ نظر تھا جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مسئلہ تھا ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مستقبل کا۔ تحریک حصولِ پاکستان کے دوران میں یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا رہا اور حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کے خلاف اسی سوال کو نمایاں طور پر سامنے لایا جاتا تھا کہ تقسیمِ ہند کے بعد ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو اقلیتوں کے صوبوں میں باقی رہ جائیں گے۔ اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمانوں نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کو آزادی نصیب ہو جائے، ہم پر جو آفتیں آئیں گی ہم برداشت کر لیں گے۔ اُن کا یہ مسلک در خورِ ہزار تبریک و تہنیت تھا اور اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں پر ان کا یہ احسان ایسا عظیم القدر ہے جسے شرافتِ نفس کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہمارے ان مسلمان بھائیوں کی طرف سے یہ رویہ اختیار نہ کیا جاتا اور وہ اپنی حفاظت و عافیت کے خیال کو مقدم رکھ کر تحریکِ پاکستان کے مخالفین کے ہم نوا ہو جاتے تو ہمارا مقدمہ کبھی کا خارج ہو چکا ہوتا۔ انھوں نے اس باب میں اپنی انتہائی کشادہ نگہی بلند ظرفی، اخوتِ اسلامی اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا جس کی یاد میں ہر پاکستانی کی نگاہیں احترام و محبت سے جھک جانی چاہئیں۔

مسلم لیگ کی طرف سے اس باب میں یہ کہا جاتا رہا کہ اگر ہماری اقلیتیں ہندوؤں کے صوبوں میں ہوں گی تو اُن کی اقلیتیں ہمارے ہاں بھی ہوں گی، جو ہماری اقلیتوں کی حفاظت و ضمانت کیلئے

ضمانت وریغال کا کام دیں گی۔ تقسیم ہند کے بعد حالات نے ایسی شکل اختیار کی کہ پاکستان سے غیر مسلم اقلیتیں ہنگامی طور پر ہندوستان کی طرف منتقل ہو گئیں۔ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا یا ہندوؤں کے منظم پروگرام کا ایک حصہ، اس بحث کو سردست نہ چھیڑیئے۔ وجہ اس کی کچھ بھی ہو، نتیجہ بہرحال یہی ہوا کہ پاکستان سے غیر مسلم اقلیتیں ہندوستان کی طرف چلی گئیں۔ اور آج شکل یہ ہے کہ (بجز صوبہ سندھ کے) پاکستان میں شاید ہی ہندو یا سکھ کہیں دیکھنے کو ملتا ہو۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان بالعموم مشرقی پنجاب اور دہلی اور اس کے مضافات سے باہر آسکے ہیں اور ہندوستان کے باقی صوبوں میں وہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ لہٰذا بحیثیتِ مجموعی نتیجہ یہ رہا ہے کہ ہماری وہ دلیل جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی حفاظت وعافیت کے لئے محکم سمجھی جاتی تھی، پہلے ہی وار میں ختم ہو گئی، اور وہ غیر مسلم اقلیتیں جنھیں ہم اپنی اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت قرار دیا کرتے تھے ہمارے ہاتھوں سے نکل کر اپنے مستقر تک جا پہنچیں، اور نامساعدت حالات نے ہمیں ایسا بے دست وپا کر دیا کہ ہم اس باب میں کچھ بھی نہ کر سکے۔

اس صورتِ حالات نے ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے مستقبل کے مسئلہ کو نازک سے نازک تر بنا دیا۔ اس مسئلہ کی نزاکت واہمیت کا تقاضا تھا کہ جلد از جلد اس کے متعلق ایک قطعی فیصلہ کیا جاتا تاکہ وہ جان لیتے کہ انھیں اب کس نہج واسلوب کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں بڑے تساہل سے کام لیا گیا۔ اور نتیجہ اس تاخیر کا یہ ہوا کہ وہاں مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ حیاتِ اجتماعیہ سے مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ قوم جس وقت زندگی کے کسی دوراہے پر پہنچے، فوراً اجتماعی طور پر اس کے رخ کا تعین کر دیا جائے تاکہ وہ انفرادی طور پر اپنے لئے آپ فیصلہ کر کے تشتت وانتشار کی صورت اختیار نہ کر جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ حوادثِ پنجاب نے توجہات کو اس درجہ اپنے اندر جذب کر رکھا تھا کہ کسی دوسری طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ یہ دلیل اس تعویق کے لئے ایک بڑی حد تک وجہ جواز ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ چیز بجائے خود محلِ نظر ہے کہ حوادثِ پنجاب کے عواقب ونتائج کو ایسی توجہ ہی بھی گئی ہے

جس کے وہ مستحق تھے اگر اتنا بھی ہو جاتا، تو کم از کم ایک مسئلہ کا حل تو تسلی بخش ہو جاتا۔ لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ

حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں

نہ پاکستانی مسلمانوں کے مصائب و آلام کا اطمینان بخش علاج ہو سکا اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کی چیخ و پکار کی طرف بروقت توجہ دی جا سکی۔ بارے شروع دسمبر میں کراچی میں مسلم لیگ کا آخری اجتماع ہوا اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی جداگانہ اجتماعی تشکیل کریں اور ان کے مسائل کا حل ان کی اپنی جماعت سوچے۔

اس فیصلہ کی تائید میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں میں حالات اس درجہ متغائر اور وہاں کے رہنے والوں کے تقاضے اس قدر متبائن ہیں کہ ایک مشترکہ آرگنائزیشن ان کی قیادت کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی۔ لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ لکم دینکم ولی دین۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں مملکتوں کے احوال و ظروف بالکل مختلف ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے داعیات و مطالبات پاکستانی مسلمانوں سے الگ۔ اس لئے وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضا ہے کہ دونوں مملکتوں کے مسلمانوں کی الگ الگ جماعتی تشکیل کر دی جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس "آرائشِ خمِ کاکل" میں ایسے "اندیشہ ہائے دور و دراز" کے اسباب و وجوہ مضمر ہیں جو ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دن اسی دورِ جاہلیت کی زندگی کی طرف لے جائیں جس سے نکلنے کی کچھ توقعات پیدا ہو رہی تھیں۔

ہماری تحریکِ آزادی کی بنیاد اس اٹل دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی، نسلی، لسانی، دولتی امتیازات ہمارے نزدیک وجۂ جامعیت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے تمام مسلمان، باوصفِ اختلافاتِ نسل و رنگ و زبان و حدود و ثغور، سب ایک قوم کے افراد ہیں، اور ان کے مقابل میں تمام غیر مسلم ایک الگ قوم کے افراد۔ یہ وہ آواز تھی جو صدیوں کے بعد شاہی مسجد لاہور کے میناروں تلے سونے والے مردِ حق آگاہ

(علامہ اقبالؒ) کی بصیرتِ قرآنی اور فراستِ ایمانی کے تصدق، کفرزارِ ہند سے بلند ہوئی، یہی وہ دعوت تھی جسے عام کرنے کے لئے خدائے قدوس کی طرف سے حضرات انبیائے کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت وجود میں آیا۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ تمہارا بیٹا تم میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ شیوۂ حق پرستی میں تمہاری جماعت سے ہم آہنگ نہیں، تو وہ اسی دعوت کی پکار تھی۔ اور جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور قوم سے کہا کہ

إِنَّا بُرَآؤُا مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ	ہم تم سے اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم معبودیت اختیار
مِن دُونِ اللهِ ۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا	کئے ہوئے ہو اُن سے قطع علایق کرتے ہیں ہم تم سے
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ	بیزار ہیں اور تمہارے اور ہمارے درمیان ابدی طور پر
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللهِ	دشمنی اور نفرت رہے گی، تاوقتیکہ تم ایک اللہ پر
وَحْدَهُ (۴-۶۰)	ایمان لے آؤ۔

یہی وہی صوتِ سرمدی تھی، جب حضرت لوطؑ نے اپنی رفیقۂ حیات کو بھی اپنے اہل میں سے قرار نہ دیا اس لئے کہ وہ جذبۂ ایمان نہ رکھتی تھی۔ تو اس وقت بھی اسی حقیقت کی پردہ کشائی مطلوب تھی، اور جب یروشلم کی گلیوں میں جنابِ مسیحؑ نے یہ وعظ فرمایا کہ میری برادری انہی غریب ماہی گیروں پر مشتمل ہے جنھوں نے آسمانی بادشاہت کے تصور کو اپنے لئے وجۂ فروغِ دیدہ بنایا ہے تو اس وقت بھی اسی اصولِ محکم کا اعادہ مقصود تھا اور پھر جب ان سب سے آخر بدر و حنین کے میدانوں میں باپ کے مقابل بیٹا اور بھائی کے خلاف بھائی شمشیر بدست استادہ تھا تو اس وقت دنیا نے انسانوں کی اس تقسیم ازلی و فطری کو اپنی مکمل صورت میں مبرہن دیکھا تھا۔ یہی وہ بظاہر دنیا جہان سے نرالی لیکن درحقیقت عین مطابقِ فطرت تقسیم تھی۔ جس کی رو سے حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، پارس کے سلمانؓ تو اپنوں میں سے تھے لیکن خود خاکِ مکہ کا ابولہب بیگانوں میں سے تھا۔ اس تقسیم نو نے دنیا میں مساواتِ انسانی کی ایسی جنت قائم کردی جس کی نظیر دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس جنت کو بہشتِ خلد، بدلی بہ جہنم کردیا اور ایک امتِ واحدہ متعدد امتوں میں اور ایک ملتِ متمیز

مختلف ملتوں میں بٹ گئی، اور اس طرح یہ بنیانِ مرصوص، ریت کے منتشر ذروں کی طرح بکھر کر آسودۂ خاک ہوگئی۔ اور اس کے بعد تاسف بالائے تاسف کہ مغرب کی اندھی تقلید سے انھوں نے بھی جغرافیائی اور نسلی حدود و قیود کو قومیت کا مدار قرار دیدیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیفیت ہوگئی کہ

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی

یہ وہ وقت تھا، جب خاکدانِ ہند سے پھر یہ آواز اٹھی کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس طرح وہ صدیوں کا بھلایا ہوا نغمۂ لاہوتی، مضطرب قلوب کے لئے فردوسِ گوش بنا۔ حقیقت بیں نگاہیں اس آواز پر وجد کرتیں اور قدم قدم پر اس بارگہ صمدیت کے عتبۂ عالیہ پر سجدہ ریز تھیں جس نے قرآنی تعلیم کی اس اصلِ عظیم کی بارِ دگر بہندی کے لئے اس خطۂ ارض کو منتخب کیا، اور اس طرح وہ سعادتِ عظمٰی، جو ہر سعید روح کے لئے باعثِ ہزار تسکین و طمانیت تھی، اس کے حصے میں آئی۔ تحریکِ پاکستان یقیناً قوم کے لئے ایک ملکِ عظیم کے حصول کا ذریعہ تھی، لیکن اس سے کہیں بڑھ کر وجۂ شادمانی یہ حقیقت تھی کہ یہ تحریک اس فراموش کردہ حقیقت کو بارِ دگر سامنے لانے کا موجب تھی اور توقع کی جاتی تھی کہ یہ آواز جو اس خطۂ ارض سے اٹھی ہے، رفتہ رفتہ تمام کرۂ ارض کے مسلمانوں کو محیط ہو جائے گی، اور اس طرح، ملکوں اور نسلوں کی چار دیواریوں میں گھرا ہوا مسلمان پھر سے قیود ناآشنا اور حدود فراموش ہو کر امتوں کی بجائے ایک امتِ واحدہ، اور ملتوں کی بجائے ایک ملتِ شریفہ بن جائے گا۔

حصولِ پاکستان کے بعد ملک دو حصوں میں ضرور بٹ گیا ہے۔ لیکن اس سے ہندوستان کے برصغیر میں بسنے والا مسلمان کبھی دو حصوں میں نہیں بٹ سکتا۔ اسی لئے کہ دین کا وہ رشتۂ استوار جس نے ان تمام افراد کو باہم دگر منسلک کر کے ایک قوم بنا رکھا ہے، ان میں زندہ و پائندہ بدستور موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ محض نظامِ حکومت کے اختلاف سے یہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں؟ لیکن اجتماعِ کراچی کا وہ فیصلہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اس خطرہ کو سامنے لا رہا ہے کہ کہیں

پاکستان اور ہندوستان کی حدِ فاصل ان دو مملکتوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے بھی خطِ تفریق نہ بن جائے اور اس طرح وہ خواب جو ہمارے مضطرب قلوب کے لئے مسرت و طمانیت کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے تھا، خوابِ پریشاں نہ بن جائے۔ غور کیجئے افغانستان اور سرحد کے پٹھانوں کے درمیان بالآخر کون سی سدِ سکندری حائل ہے جس نے انہیں دو مختلف قوموں کے افراد (Nationals) بنا رکھا ہے۔ یہ دیوارِ آہنی محض دو الگ حکومتوں کا وجود ہی تو ہے۔ اسی غلط نظریۂ حکومت کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان میں الگ الگ حکومتوں کا وجود، ان ہر دو مملکتوں کے مسلمانوں کے لئے الگ الگ قومیتوں کا مدار بن سکتا ہے۔ اس لئے آج وہ فیصلہ جو بالکل معصوم سا نظر آتا ہے اور جس کے جواز کے لئے بہت سی مصلحت اندیشیوں کو بطورِ دلیل پیش کیا جا سکتا ہے، آنے والے مہیب خطرہ کا موجب بن سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ہر وہ قدم جو ہمیں پھر سے اس عہدِ جاہلیت کی طرف لے جانے کا مبہم سا اندیشہ بھی پیدا کر دے اس قابل ہے کہ اسے پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا جائے۔ اس بنا پر ہم چاہتے تھے کہ ایسا فیصلہ نہ ہی ہوتا تو اچھا تھا لیکن اس فیصلے کے باوجود ہم ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں سے بصد منت التجا کریں گے کہ وہ ہر مصیبت[1] کو برداشت کر لیں لیکن اپنے آپ کو پاکستان کے مسلمانوں سے ایک الگ قوم نہ بننے دیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس راہ میں بڑے بڑے مہیب خطرات ہیں لیکن اگر آپ نے دس برس تک ہر منبر و محراب اور اسمبلی اور اسٹیج سے اس حقیقت کی شہادت دی ہے کہ تمام مسلمان ایک ملتِ واحدہ ہیں اور یہ کسی دوسرے کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کے اجزا نہیں بن سکتے، تو اس صداقتِ عظمیٰ کی خاطر ہر آفت کو جھیل جایئے،

ہم جانتے ہیں کہ

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے

---

[1] حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم، ابوالکلام صاحب آزاد نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ "ہندوستان میں ہر شہری، بلا تمیز فرقہ، یکساں حقوق کا مستحق ہوگا لیکن جو شخص ابھی تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا عقیدہ رکھتا ہو اس کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔" (ڈان مورخہ ۱۲ جنوری)

لیکن دیارِ حق و صداقت کی مصلحت فراموشیوں کا تم سے یہی تقاضا ہے کہ ایک بار پھر سے دنیا کو دکھا دو کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس کے ساتھ ہی ہم پاکستان کے مسلمانوں سے بھی پورے زور سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر تم نے دس برس تک اس دعوے کو کہ ہماری جداگانہ قومیت کا مدار مذہب پر ہے، محض مقدمہ جیتنے کے لئے بطور ایک وکیلانہ دلیل کے استعمال نہیں کیا، بلکہ یہ تمہارے ایمان کی پکار اور دل کی آواز تھی، تو اپنے آپ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے الگ قوم تصور نہ کرو اور ایک ثانیہ کے لئے بھی اس فریب کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دو کہ مملکتوں کی تقسیم سے تم دو الگ قومیں بن گئے ہو، ہندوستان کا مسلمان، تمہارے جگر کا ٹکڑہ، تمہارے ناخن کا گوشت، تمہاری آنکھوں کا نور اور تمہارے دل کا سرور ہے۔ یہ کہیں رہے، تمہاری قوم کا فرد، تمہاری برادری کا رکن، تمہاری تسبیح کا دانہ اور تمہاری دیوار کی اینٹ ہے۔ اس باب میں ہماری نگاہیں اب پاکستان مجلس آئین ساز (Constituent Assembly) کے آئندہ اجلاس پر مرکوز ہیں کہ وہ ہندوستان کے مسلمان کو کیا آئینی حیثیت دیتی ہے۔ اسی فیصلہ پر اس حقیقت کا مدار ہوگا کہ ہم نے دس برس تک اپنے قرآنی نظریۂ قومیت کو ایک صداقتِ ازلی کی حیثیت سے پیش کیا تھا یا اسے محض بطور ایک حیلۂ حرب (Strategic Stunt.) کے اختیار کر رکھا تھا۔

معذرتِ تکرار کے ساتھ ہم ایک مرتبہ پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ ہم اس مسئلہ کو اس لئے اس قدر اہمیت دے رہے ہیں کہ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر آج اس سوال کو معمولی سمجھ لیا گیا تو دس برس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہندوستان میں بسنے والا مسلمان آہستہ آہستہ (جبراً نہیں تو غیر محسوس طور پر) ہندوستانی قومیت کا جزو بن کر اپنا جداگانہ ملی تشخص کھو بیٹھے گا اور پھر اس کے بعد ہندو کی متحدہ قومیت کی کانِ نمک میں مدغم ہو جائے گا۔ پاکستان کا مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت برقرار رکھے گا لیکن اس لئے نہیں کہ ان میں وجہ جامعیت اور باعثِ تعمیرِ قومیت مذہب ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کی

حکومت ایک ہے، جیسے افغانستان کے مسلمان حکومت کی بنا پر الگ قومیت رکھتے ہیں (اور یہی یورپ کی نیشنلزم ہے) اور اس کے بعد، اسی وجۂ جامعیت کی بنا پر، یہاں کا غیر مسلم بھی اسی قومیت کا جزو قرار دیا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں، جیسا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا ہے[1]۔ اس وقت پاکستانی مسلمان کا ذہن اس چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ غیر مسلم بھی اس کی قوم کا جزو بن سکتے ہیں۔ اس لئے پاکستان کے مسلمان نے مسلسل دس برس تک اس ایک سوال پر ہندو اور انگریز سے جنگ لڑی ہے اور اسی بنیادی فرق کی بنا پر دنیا سے جداگانہ حقِ استقلال منوایا ہے۔ اس لئے ابھی اس کا ذہن اس نظریۂ قومیت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی قومیت سے الگ کر کے اپنی قومیت کے دائرہ کو محض پاکستانی حدود یا وحدتِ حکومت کے

---

[1] بی بی سی کے ایک نمائندہ نے اپنے دورانِ ملاقات میں قائدِ اعظم سے دریافت کیا کہ "کیا پاکستان کی مسلم لیگ آخر الامر ایک قومی جماعت (National Organisation) بن سکے گی جس کی رکنیت تمام مذاہب کے پیروؤں کے لئے کھلی ہوگی؟" اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے ارشاد فرمایا۔

اس قسم کی قومی جماعت (National Organisation) کے لئے ابھی وقت مساعد نہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کا ذہن ابھی اسے قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔ (ڈان ۲۰ ۱۲/۴۷)

یہ بیان جن الفاظ میں اخبارات میں شائع ہوا ہے، ایک بہت بڑی غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے اس سے مفہوم یہ لیا جائے گا کہ خود قائدِ اعظم کے نزدیک مسلم لیگ جب تک خالص مسلمانوں کی جماعت ہے، قومی جماعت (National Organisation) نہیں بلکہ ایک فرقہ وارانہ جماعت (Communal organisation) ہے۔ یہ قومی جماعت اس وقت بن سکے گی جب یہ مختلف مذاہب کے مخلوط نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ ہم اسے کبھی باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قائدِ اعظم کا اس سے یہی منشا تھا۔ اس لئے کہ جس شخص نے اسی ایک نقطہ پر دس سال تک ساری دنیا سے لڑائی مول لے رکھی تھی کہ مسلمان من حیث المسلمان ایک الگ قوم (Nation) ہیں، فرقہ (Community) نہیں ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ ان کی قومی جماعت (National organisation) ہے، فرقہ وارانہ جماعت (Communal organisation) نہیں۔ وہ شخص ایک ہی سانس میں اپنے اسے محکم دمتواتر دعوے کی خود ہی تردید کس طرح کر سکتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بی بی سی کے نمائندہ نے بات کو اچھی طرح سے سمجھا نہیں۔

نظریہ پر قائم کر لیا تو رفتہ رفتہ اول الذکر نظریہ ذہن سے اوجھل ہو جائے گا اور بنا بر وحدتِ حکومت یا وحدتِ وطن، پاکستان کا مسلمان، یہاں کے غیر مسلم کو اپنا ہم قوم سمجھنے میں کچھ بھی تردد محسوس نہیں کریگا ہمارا آج کا اسلام، چودہ سو سال پیشتر کے حقیقی اسلام سے اسی صورت میں مختلف ہوا ہے کہ جب کوئی بات ابتداءً اپنے مرکز سے سرکی تو ہم نے اسے چنداں اہمیت نہ دی اور رفتہ رفتہ تھوڑے عرصہ کے بعد اسی نے اصلی شے کی جگہ اختیار کر لی اور یوں

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اور یہی خطرہ ہمیں اس باب میں محسوس ہو رہا ہے۔

بہر حال کہہ ہم یہ رہے تھے کہ تقسیم ہند سے مسلمانوں کی قومیتِ واحدہ میں کسی صورت میں تفریق نہیں ہونی چاہیے اور اس باب میں مسلم لیگ کا حالیہ فیصلہ ہمارے نزدیک کچھ خوش آئند نہیں، اس لئے کہ اس سے وہ خطرہ مترشح ہوتا ہے جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ذرا غور کیجئے۔ ہم نے مسلمانوں کی قومیتِ واحدہ کا اعلان بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے کیا جس کی بنیاد ہمارے ایمان پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں نے اپنے اتحاد کو محض اپنے مفاد کی خاطر اختیار کیا۔ لیکن ان کی آج یہ حالت ہے کہ پاکستان میں، صرف سندھ میں کچھ ہندو باقی رہ گئے ہیں۔ باقی اپنے پروگرام کے مطابق یہاں سے نقلِ مکانی کر چکے ہیں۔ ان چند ہندوؤں کی یہ کیفیت ہے کہ سندھ پراونشل کانگرس کمیٹی نے (اواخر دسمبر میں) یہ فیصلہ کیا، اور اس فیصلے کا اعلان، پاکستان کے دارالسلطنت میں، کھلے بندوں کیا، کہ ہم اپنا تعلق کسی صورت میں بھی ہندوستان کی کانگرس سے منقطع نہیں کر سکتے۔ اس کو چھوڑیئے کہ اس فیصلہ میں سندھ کے ہندوؤں کی جرأت کا زیادہ حصہ ہے یا ہندوستان کے ہندوؤں کی قوت کا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ جنہوں نے اس اتحاد و یگانگت کو محض قومی مفاد کی خاطر اختیار کیا تھا ان کی اس کے ساتھ شیفتگی و وابستگی اس حد تک ہے۔ اور دوسری طرف ہم ہیں کہ یہ وحدتِ ملی ہمارے نزدیک جزوِ ایمان ہے اور ہم اپنے چار کروڑ بھائیوں کے متعلق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی اجتماعی

نظریہ پر قائم کر لیا تو رفتہ رفتہ اول الذکر نظریہ ذہن سے اوجھل ہو جائے گا اور بنابر وحدتِ حکومت یا وحدتِ وطن، پاکستان کا مسلمان، یہاں کے غیر مسلم کو اپنا ہم قوم سمجھنے میں کچھ بھی تردد محسوس نہیں کریگا ہمارا آج کا اسلام، چودہ سو سال پیشتر کے حقیقی اسلام سے اسی صورت میں مختلف ہوا ہے کہ جب کوئی بات ابتداءً اپنے مرکز سے سرکی تو ہم نے اسے چنداں اہمیت نہ دی اور رفتہ رفتہ تھوڑے عرصہ کے بعد اسی نے اصلی شے کی جگہ اختیار کر لی اور یوں

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اور یہی خطرہ ہمیں اس باب میں محسوس ہو رہا ہے۔

بہر حال کہہ ہم یہ رہے تھے کہ تقسیمِ ہند سے مسلمانوں کی قومیتِ واحدہ میں کسی صورت میں تفریق نہیں ہونی چاہیے اور اس باب میں مسلم لیگ کا حالیہ فیصلہ ہمارے نزدیک کچھ خوش آئند نہیں، اس لئے کہ اس سے وہ خطرہ مترشح ہوتا ہے جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ذرا غور کیجئے۔ ہم نے مسلمانوں کی قومیتِ واحدہ کا اعلان بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے کیا جس کی بنیاد ہمارے ایمان پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں نے اپنے اتحاد کو محض اپنے مفاد کی خاطر اختیار کیا۔ لیکن ان کی آج یہ حالت ہے کہ پاکستان میں، صرف سندھ میں کچھ ہندو باقی رہ گئے ہیں۔ باقی اپنے پروگرام کے مطابق یہاں سے نقلِ مکانی کر چکے ہیں۔ ان چند ہندوؤں کی یہ کیفیت ہے کہ سندھ پراونشل کانگرس کمیٹی نے (اواخر دسمبر میں) یہ فیصلہ کیا، اور اس فیصلے کا اعلان، پاکستان کے دارالسلطنت میں، کھلے بندوں کیا، کہ ہم اپنا تعلق کسی صورت میں بھی ہندوستان کی کانگرس سے منقطع نہیں کر سکتے۔ اس کو چھوڑیئے کہ اس فیصلہ میں سندھ کے ہندوؤں کی جرأت کا زیادہ حصہ ہے یا ہندوستان کے ہندوؤں کی قوت کا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ جنھوں نے اس اتحاد و یگانگت کو محض قومی مفاد کی خاطر اختیار کیا تھا ان کی اس کے ساتھ شیفتگی و وابستگی اس حد تک ہے۔ اور دوسری طرف ہم ہیں کہ یہ وحدتِ ملی ہمارے نزدیک جزوِ ایمان ہے اور ہم اپنے چار کروڑ بھائیوں کے متعلق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی اجتماعی

ہونا چاہئے۔ تو قسم ہے اس خدائے ذوالجلال کے قانونِ مکافاتِ عمل کی، جس کی موہبتِ عظمیٰ نے پاکستان کا خطۂ زمین انعام فرمایا ہے کہ دنیا اور عاقبت دونوں کی روسیاہی اور ذلت و خرابی ایسے مسلمان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ واللہ علی ما نقول شہید۔ اگر ہندوستان کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹے کی چبھن، پاکستان کے مسلمان کی آنکھ کے آبگینے سے خون نہیں ٹپکا سکتی تو جس قدر جلد یہ آنکھ اندھی ہو جائے بہتر ہے کہ اس دیدۂ بے نور سے دیدۂ کور بہتر کہ اس پر آنکھ کا گمان تو نہیں گذرے گا۔ ہندوستان کے مسلمان نے پاکستان کے مسلمان کو سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرنے کی امکانی قوت حاصل کرنے میں پورے ایثار اور قربانی سے کام لیا۔ اب، پاکستان کے مسلمان کا فرض ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کو عزت و احترام کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہیں۔ مرج البحرین یلتقیٰن۔

یہ ہے وہ اصلِ عظیم جس کے ماتحت ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا حل سوچیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(اس باب میں ایک نگاہ اسی اشاعت کے "حقائق و عبر" پر بھی ڈال لینی چاہئے)

ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اس بُعد و فصل اور بیگانگی و مغائرت کا رونا رو رہے ہیں جس کا ہمیں مستقبل میں خدشہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ خود پاکستان کے مسلمانوں میں صوبائی تعصب اس قدر شدید ہے کہ اس کا احساس ہر قلبِ دردآگیں کے لئے وجہ ہزار اضطراب ہے۔ یوں تو یہ تعصب کم و بیش ہر جگہ موجود ہے لیکن یہ اپنی انتہا کو سندھ میں آپہنچا ہے۔ ہم سنا کرتے تھے کہ سندھ کا مسلمان، عام طور پر غیر سندھی مسلمان کے مقابلہ میں، سندھی غیر مسلم کو اپنے زیادہ قریب سمجھتا ہے۔ ہم ایسا سنتے تھے لیکن اسے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہاں آکر جو دیکھا تو دید، شنید سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ تقسیم ہند کے بعد، مرکزی حکومتِ پاکستان کے دارالخلافہ کا مسئلہ، مختلف صوبوں کے لئے وجہ جاذبیت بن رہا تھا۔ ہر صوبہ اپنے اپنے استحقاق

کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کر رہا تھا اور انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ سعادت عظمیٰ کس صوبہ کے حصے میں آتی ہے۔ بارے انتظار و تربص کا یہ زمانہ ختم ہوا اور اس مقصد کے لئے مرکزی حکومت کی نگہِ انتخاب کراچی پر آکر ٹھہری۔ اس انتخاب کی بنا پر غیر سندھی مسلمانوں کو کراچی میں آنا پڑا۔ اس کے بعد مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ کے حوادث نے اس سلسلۂ درآمد کو اور بھی تیز کر دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ سندھ کے مسلمان اس شرف واعزاز پر مسرتوں کے جھولے جھول رہے ہوں گے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ انہیں بالعموم سخت گراں گذر رہا ہے۔ ہم محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ! باہر سے آنے والے مسلمانوں کی کس بات سے انہیں اس قدر قلبی اذیت پہنچ رہی ہے۔ غور سے دیکھا تو اس کی وجہ بجز "سندھی اور غیر سندھی" کی اس تفریق کے، جو ان کے تحت الشعور میں ہر وقت انگڑائیاں لیتی رہتی ہے اور کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد اس مغائرت و تفریق کے مظاہرے قدم قدم پر دکھائی دینے لگے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے ہیں کہ بارالٰہا! یہ وہ سرزمین ہے جہاں کفرزارِ ہند میں سب سے پہلے اسلام کے قدوم برکات لزوم آئے اور یہیں آج یہ حالت ہے کہ عہد جاہلیت کی یہ عصبیت اس درجہ شدید ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ "سندھی اور غیر سندھی" کی یہ تمیز بالآخر ہے کیا؟ انگریزوں نے انتظامی مصالح کی خاطر ملک کو مختلف خطوں میں تقسیم کیا۔ اب سوچئے کہ اسلام کی اس عالمگیر برادری میں جہاں حدود و قیود کو کہیں بار نہیں، بھلا یہ تقسیمی خطوط بھی کچھ حیثیت رکھتے ہیں! لیکن ہماری بدبختیوں کا کیا علاج! مسلمانوں کی زندگی کے تو ہر شعبہ میں عہد جاہلیت کے آثار و مظاہر سرایت کر چکے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود سندھی مسلمانوں میں ایسے بالغ نظر افراد موجود ہیں جن کی نگاہیں اسلام کی قیود نا آشنا مواخات و مساوات کو خوب پہچانتی ہیں۔ اور ان کی وسعتِ قلب سندھی و غیر سندھی کی تنگنائے عصبیت کی حدود میں مقید نہیں۔ لیکن ایسے حضرات کا وجود خال خال ہے۔ یہاں کی اکثریت اسی جہالت کا شکار رہے جو ہمارے لئے باعث ہزار شرم و تاسف ہے۔

ہم

(۱) سندھی مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ سندھی اور غیر سندھی کی تفریق یکسر غیر اسلامی ہے۔

اس لئے وہ جتنی جلدی اس عصبیت کو اپنے دل سے الگ کردیں اتنی ہی جلدی وہ حقیقی اسلام سے قریب آجائیں گے۔

(ii) غیر سندھی مسلمانوں سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے حسنِ سلوک اور مروت و اخلاق سے ایسی کشادہ نگہی اور وسیع القلبی کا ثبوت دیں کہ سندھ کا مسلمان انھیں اپنا سمجھنے پر مجبور ہوجائے۔

(iii) حکومت سندھ کے اربابِ بست وکشاد سے عرض کریں گے کہ وہ دورانِ نظم ونسق میں کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے دیں جس سے ذرا بھی مترشح ہوسکے کہ یہاں سندھی اور غیر سندھی میں تمیز کی جاتی ہے۔ اور

(iv) مرکزی حکومت کے عمائد وارکین سے التماس کریں گے کہ جب آپ کے انتخاب کی بنا پر کراچی ایک ہمہ گیر شہر کی حیثیت اختیار کررہا ہے تو آپ یہاں کے انتظامی امور میں ایسی دلچسپی لیں کہ یہ بلدِ امین سواء ن العاکف فیہ والباد (۲۲/۲۵) (یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے بالکل یکساں) کا مصداق بن جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس تنذیر کو عام کردیں کہ ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم (۲۲/۲۵) جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ ناانصافی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک سزا کا مزہ چکھائیں گے)

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں خطرہ ہے کہ "سندھی اور غیر سندھی" کی جو خلیج اس وقت قلوب کی دنیا میں حائل ہورہی ہے۔ وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی۔ اور یہ انتشار ایک اور مصیبت کا موجب بن جائے گا۔ وفیھا بصائر لقوم یعقلون۔

اس باب میں قائدِ اعظم کے ارشادات ہر پاکستانی کے لئے بروقت تنبیہ و تنذیر کا حکم رکھتے جو انھوں نے یوم عید میلاد النبی کے ایک اجتماع میں کراچی میں ارزانی فرمائے۔

میں چاہتا ہوں کہ مسلمان صوبائی تعصب کے اس مرض کو دل سے دور کردیں، یہ امر اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے باعثِ لعنت ہے کہ ان کا ذہن ابھی تک سندھی، پنجابی، پٹھان اور

دہلوی کے تنگ دائروں میں گھوم رہا ہے۔ (ڈان ۲۶)

خدا کرے جلد وہ دن آجائیں کہ ہمارے سندھی بھائی، باہر سے آنے والے غیر سندھی مسلمانوں کو اپنے دل کا ٹکڑا سمجھیں اور غیر سندھی مسلمان، یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں، اور ان دونوں کی باہمی مواخات و محبت سے، پھر سے ان شرمندگانِ ساحل کے اچھل کر بیکراں ہو جانے کا وہ نظارہ وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدۂ حساس مضطرب و بیتاب ہے۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان بے ساختہ ہمارے سامنے آگئے ہم اس باب میں ان کی خدمت میں بھی ایک گذارش ضروری سمجھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب وغیرہ کے حوادثِ قیامت انگیز کے سلسلہ میں مغربی پاکستان کچھ اس طرح ابھر کر سامنے آگیا کہ مشرقی پاکستان کچھ وقت کے لئے ایک طرف ہٹ گیا۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح فساداتِ کلکتہ اور محشرستانِ بہار کے زمانہ میں تمام مسلمانوں کی توجہات انہی علاقوں پر مرتکز ہو گئی تھیں اور دوسرے علاقے دوسری طرف ہٹ گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان، اُس ملکِ عظیم کے اجزائے لاینفک ہیں جسے فطرت کی ذرہ نوازیوں نے مسلمانانِ ہند کو عطا فرمایا ہے۔ یہ دونوں حصے، آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشائی کرنے والے شہبازِ پاکستان کے دو بازو، اور مملکتِ پاکستان کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جن میں سے اگر ایک کمزور ہو جائے تو دوسرا از خود بیکار ہو جاتا ہے پاکستان کا ملکِ عظیم، ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اسی طرح عنایت ہوا ہے جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات ملنے پر ارضِ مقدس کی مملکت بطورِ انعام ملی تھی۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے فرمایا ہے کہ۔

لہ اس موضوع پر جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کا ایک بصیرت افروز و حقائق پرور مبسوط مقالہ ہمارے پاس آچکا ہے۔ آئندہ پرچہ میں ہم اس کی اشاعت کا فخر حاصل کریں گے۔

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون اور جس قوم کو کمزور و ناتواں خیال کیا جاتا تھا، اسی ہم نے
مشارق الارض ومغاربھا التی ملک کے اس مشرقی اور مغربی حصہ کا مالک بنا دیا جس
برکنا فیھا (۱۳۷) میں ہم نے اپنی برکات کی گہرباری کی تھی۔

بعینہٖ اسی طرح ہمیں اس ملک کے مغربی اور مشرقی حصوں کا مالک بنایا گیا ہے جس میں ہم اس قدر کمزور و ناتواں سمجھے جاتے تھے۔ قرآن نے ملتِ اسلامیہ کی ہمہ گیریت و آفاقیت کی بنا پر مشرق و مغرب کے بُعد مکان کا تصور آج سے چودہ سو سال پیشتر اذہانِ انسانی سے نکال دیا تھا جب اس نے فرمایا تھا کہ وللہ المشرق والمغرب (مشرق و مغرب سب خدا کے ہیں) اور آج سائنس کے انکشافات نے زمین کی طنابیں کچھ اس طرح کھینچی ہیں کہ مشارق و مغارب کے بُعد و فصل فی الحقیقت کالعدم ہو چکے ہیں، اس لئے پاکستان کے مسلمانوں میں مشرق و مغرب میں تمیز و تفریق، ایک حقیقتِ ابدی کا بطلان اور ایک صداقتِ ازلی کی تکذیب ہے۔ ہم اپنے سینوں کو اُس آفتابِ جہانتاب کی درخشندہ شعاعوں سے منور کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کے متعلق فرمایا کہ لاشرقیۃ ولاغربیۃ (جو نہ شرقی ہے نہ غربی) اس لئے اگر ہمارے ذہن میں ایک ثانیہ کے لئے مشرقی و مغربی پاکستان میں کسی قسم کی مغایرت و تفریق کا تصور بھی آگیا تو ہم ان ازلی صداقتوں کے عملی منکر ہوں گے، جن پر ایمان ہمارے لئے وجہ سعادتِ کونین ہے۔ یہ امتیازات اُس دورِ جاہلیت کی تخلیق تھے جسے ہم جھٹک کر الگ کر چکے ہیں اس لئے اب ان کی یاد تک بھی ہمارے دلوں میں نہ آنی چاہئے کہ جو بُت حریم کعبہ سے ایک مرتبہ نکال دیئے گئے وہ وہاں دوبارہ باریابی نہیں پا سکتے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمیز کسی مردِ مسلمان کے دل میں اپنی جگہ نہیں پیدا کر سکتی۔ یہی وہ مقام تھا جس کے متعلق اُس مردِ حق آگاہ نے مدت ہوئی کہا تھا جسے فطرت نے نگاہِ فراستِ قرآن کے نور سے توانا کیا تھا کہ

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

ہمیں زمانہ کو بتا دینا چاہیے کہ اب ہمارے پروں پر اس عہدِ جاہلیت کے غبارِ رنگ و نسب کے نشان تک بھی نہیں ہیں کہ اب یہ سب کچھ ایک ہی رنگ میں رنگا جا چکا ہے اور اللہ کے رنگ سے اور کون سا رنگ بہتر ہو سکتا ہے۔ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔

۳۱ ۱/۴۸ ہندوستان کے ارباب اقتدار میں دو متخالف پارٹیوں کا وجود تشکیل حکومت سے بہت پہلے ظہور میں آچکا تھا۔ ان پارٹیوں کے منافقتی اختلافات کی خلیج کس درجہ وسیع اور گہری ہوتی جارہی تھی، اسے سجد صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کے باوجود اس کی چلبنی سی جھلکیں اکثر بیرونی دنیا کی نگاہوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ بالآخر یہ اختلاف اس ناشدنی حادثہ تک منتج ہو کر رہا جو ہندو قوم کے لئے فی الحقیقت ایک ناقابل تلافی نقصان کا باعث اور دنیا کے ہر اس انسان کے لئے جس کے نزدیک خونِ ناحق ایک جرم عظیم ہے وجہ ہزار تاسف ہے۔ ان سیاسی پارٹیوں کے اختلاف کی ذاتی وجوہات سے قطع نظر، اصولی اختلاف کی یہ بنیاد قرار دی جاتی ہے کہ ان میں سے ایک کا خیال ہے کہ ہندوؤں کی حکومت کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا وجود ختم کر دیا جائے لیکن دوسری پارٹی کا خیال ہے کہ اگر ان کا وجود ختم کر دیا گیا تو پھر ہندو حکومت کس پر کریں گے، اس لئے مسلمانوں کا باقی رکھنا ہی ترینِ مصلحت ہے۔ دونوں کے پیش نظر مقصد ایک ہی ہے، اختلاف طریق کار یا ذریعہ حصول مقصد کا ہے۔ مہاتما گاندھی اس آخر الذکر پارٹی سے متعلق تھے اور ان کا آخری فاقہ اس حقیقت کے اعتراف کا چہرہ کشا تھا کہ فریق مخالف کسی دلیل و برہان سے قائل ہونے پر تیار نہیں۔ گاندھی جی کے اس اقدام سے فریق مخالف پر اخلاقی دباؤ پڑنے کی وجہ سے اسے شکست تو ہوئی لیکن اس کی یہ سپر اندازی محض پینترا بدلنے کے مرادف تھی۔ اس نے بالآخر وہ ہتھیار سنبھال لیا جو فسطائیت کی قوتوں کی محکم "دلیل" اور ناقابل تردید "برہان" ہوا کرتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ اس واقعہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا جس کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔ یہ واقعہ ہماری دنیا کے لئے غیر متوقع ضرور ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آنے والے مورخ کے نزدیک یہ ایسا غیر متوقع اور اس قدر باعث حیرت و استعجاب نہیں ہوگا جب وہ دیکھے گا کہ ہندوؤں کی یہ پارٹی ایک عرصہ دراز سے اپنی عسکری تنظیم میں مصروف تھی۔ اس نے ملک بھر میں باقاعدہ فوج تیار کر رکھی تھی جو ہر قسم کے آلات ضرب و حرب سے آراستہ اور ادوات فنا و استہلاک سے مسلح تھی۔ یہ سب کچھ مہاتما گاندھی اور ان کی پارٹی کے سامنے ہو رہا تھا۔ لیکن وہ یا تو دانستہ نہیں

دبانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ یا پھر وہ اپنے اندر اتنی قوت نہیں پاتے تھے کہ تخریب و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کر سکیں۔ بہر حال ان کی مصلحت کوشی ہو یا عدم استطاعت۔ نتیجہ یہ کہ یہ عفریتی قوتیں روز بروز سیلاب کی طرح بڑھتی اور شعلوں کی طرح پھیلتی گئیں اور ہر جگہ مسلمان ان کی لپیٹ میں آ کر راکھ کا ڈھیر بنتے چلے گئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ دوسرا فریق، ان جناتی اژدہوں کو دبانے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتا تھا تو انہیں بہت پہلے اس کا اعلان کر دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے ایسا سمجھنے میں کہ یہ قوتیں انگریزوں کو مرعوب کرنے یا مسلمانوں کے کشت و خون اور قتل و غارتگری تک ہی محدود رہیں گی، سخت غلطی کی۔ اگر کسی کا بچہ کسی دوسرے کو گالی دے اور اس کا باپ یہ سمجھ کر یہ گالی دوسرے ہی کو دی گئی ہے، اس لئے طمانچہ نہ مارے، تو وہ اپنے آپ کو بہت بڑے فریب میں رکھتا ہے۔ جب اس بچہ کو گالی کی عادت پڑ جائے گی تو وہ ہمسایہ اور باپ میں تمیز نہیں کریگا اگر یہ پارٹی اس وقت، جب سانپوں کی یہ پٹاری پہلے ۱۹۴۶ء میں ملک میں عام فسادات مچانے اور پھر بہار، گڑھ مکتیسر، مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کی غارتگری کے لئے کھولی جا رہی تھی، ان کی سرکوبی کے لئے باہر آ جاتی تو ان سانپوں کی رسائی ان کی محبوب ترین ہستیوں تک کبھی نہ ہوتی۔ ۱۹۴۶ء کے فسادیوں کو قوم کا ہیرو بنایا گیا۔ مسلمانوں کا خون پینے والوں کو سر چڑھایا گیا۔ جب ان کی یوں حوصلہ افزائی کی گئی تو پھر اس بات کی کیا شکایت کہ ان کا دست تطاول آج خود ان کی عزیز ترین متاع تک بھی پہنچ گیا۔ ہمیں اس کا جید رنج ہے اور وہ کونسا دل ہے جس میں احترام انسانیت کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے۔ اس زندگی پر جس سے مہاتما گاندھی کی جان لی گئی ہے .... خون کے آنسو نہ روئے۔ ایسی کمزور و نحیف سی جان، اور اسے اس طرح گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے، اور پھر اس قوم کے ہاتھوں جو اس کی پرستش کرتی تھی، یہ صرف فسطائیت کی بے زمام قوتوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ جنہیں ناموس انسانیت اور احترام آدمیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جب وہ جذبات نفرت سے مغلوب اور جوش انتقام سے اندھی ہو جاتی ہیں تو پھر انہیں اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے نشتر کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان نسطائی قوتوں کا جذبہ محرکہ ہنگامی امیال و عواطف نہیں ہیں بلکہ اس کی اساس، آریہ قوم کی اس سیاست پر ہے جس کی بنیاد اس نفرت پر ہے۔ ذرا سوچیے، سورن (اونچی ذات کے) ہندو، جس قدر اچھوتوں سے نفرت کرتے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی وحشی سے وحشی قوم میں بھی نہیں پائی جائے گی۔ پھر مسلمانوں کی آمد پر، انہوں نے جس چھوت چھات کا مظاہرہ کیا، اور اس میں سیاسی مسلک کو مذہب کا مقدس لبادہ اڑھا کر، اسے عارضی حربہ کی جگہ ابدی حقیقت کی حیثیت دیدی، یہ بھی اسی جذبۂ منافرت کا آئینہ دار تھا۔ غور کیجئے۔ دنیائے تہذیب و تمدن میں اس سے بڑھ کر شرمناک مثال کہیں مل سکتی ہے کہ ایک انسان، دوسرے انسان کے سایہ سے بھرشٹ (ناپاک) ہو جائے! اس مسلسل منافرت نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے قریب تک نہیں آنے دیا۔ وہ انہیں ہمیشہ ایک قابل نفرت اور مستحق ذلت قوم سمجھتے رہے۔ جذبات نفرت سے قوموں میں تنگ نظری اور کوتاہ نگہی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس تنگ نظری کی مثال ہندوستان کے عہد حاضرہ کی سیاست میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ اگر ہندو اس باب میں ذرا کشادہ ظرفی کا ثبوت دیتے، اور مسلمانوں کے مبنی بر عدل و صداقت مطالبہ کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیتے تو اس بدبخت ملک میں وہ فساد و خلفشار کبھی نہ ہوتا جس نے انہیں دنیا کی مہذب قوموں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اس نفرت و تنگ نگہی سے یہ نسطائی قوتیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں اور آج وہ گالی دینے والے بچے کی طرح، مسلمانوں سے آگے بڑھ کر، خود ان ہندوؤں تک کے گلوگیر ہو رہی ہیں جن سے انہیں ذرا سا اختلاف ہوتا ہے یا جن کے خلاف انہیں نفرت دلا دی جاتی ہے۔ یہ صورت حالات ایسی نہیں جسے محض اس ایک انفرادی واقعہ تک محدود سمجھا جائے۔ اس کے نتائج بہت دور رس اور اس کے عواقب بہت خطرناک ہیں۔ اس لئے ان تمام قوتوں کو جو دنیا میں قانون اور نظام کا احترام باقی رکھنا چاہتی ہیں، اور یہ نہیں چاہتیں کہ نسطائی قوتوں کو بے لگام چھوڑ کر دنیا کو درندوں کا کھبٹ بنا دیا جائے۔ انہیں اس مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ سمجھ کر اس کے حل کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر ہندوستان کی اس نسطائیت کو، جو اس طرح روز بروز آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور جس کے سامنے اب ان کے اپنے افراد بھی

بے دست و پا ہو چکے ہیں، حتیٰ کہ وہ ہستی بھی جسے وہ قوم ساری دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغامبر سمجھتی تھی، ان کے چنگل کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکی، اسی طرح بے زمام چھوڑے رکھا تو ساری دنیا کا امن خطرے میں پڑ جائے گا اور دنیا کو پھر ایک عالمگیر جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمارے لئے یہ مسئلہ اس لئے بھی خاص طور پر وجہ صد تشویش و باعث ہزار اضطراب ہے کہ ہمارے چار کروڑ مسلمان بھائی ان ہی درندوں کے پنجروں میں بند ہیں۔ وہاں کی حکومت کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ (اسٹیٹسمین مورخہ ۲۱/۱/۴۸ کے بیان کے مطابق) انہیں ایک ہفتہ پیشتر مہاتما گاندھی پر بم مارنے والے کے مقدمہ کی تفتیش کے ضمن میں اس خطرہ کا احساس[1] ہو چکا تھا کہ مہاتما گاندھی کی زندگی محفوظ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کی حفاظت کا سامان نہ کر سکی۔ جو حکومت اس درجہ کمزور ہو کہ وہ اپنی عزیز ترین اور مقدس ترین متاع کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ اس سے اس امر کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ چاہے بھی تو اپنی چار کروڑ اقلیتوں کی حفاظت کر سکے گی! اس قدر وحشی اور بے مہار قوتوں کی موجودگی میں، چار کروڑ انسانوں کو اس درجہ بے دست و پا حکومت کی تحویل میں محفوظ سمجھنا، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ جہاں ان کا "خدا" محفوظ نہیں رہ سکا۔ وہاں بیچارے عام انسان کس طرح محفوظ سمجھے جا سکتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کو جلد از جلد مجلس اقوام متحدہ کے سامنے رکھنا، انہیں اس مہیب خطرہ سے آگاہ کرنے اور دنیا کو ایک اور جہنم کی آگ سے بچانے کے مرادف ہوگا۔

کیا ہمارے نمائندگان اس کی طرف توجہ منعطف فرمائیں گے؟ اگر ہندوستان کی موجودہ حکومت اس باب میں پاکستان کی امداد کی خواہاں ہو تو پاکستان کو اسے اپنی ملی ذمہ داری اور انسانی فریضہ سمجھ کر ہر ممکن مدد پیش کر دینی چاہیئے۔

---

[1] اب اخبارات میں آیا ہے کہ اسی خطرہ کے پیش نظر گاندھی جی کی حفاظت کے لئے کافی پولیس متعین کر رکھی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی پولیس بھی در پردہ اس پارٹی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

قرآنی تعلیم

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

مسلمانوں پر مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو قیامت گزری ہے اسکی کچھ کیفیت ناظرین کو خود معلوم ہے اور کچھ ان مضامین سے معلوم ہوگی جو اس رسالہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا کیا فریضہ ہے اور ان کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم کو قوم کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ تعلیم سورۂ بقرہ میں رکوع ۳۱ سے شروع ہو کر پارۂ دوم کے خاتمہ تک تقریباً دو رکوع میں ختم ہوتی ہے

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ○ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو باوجود اس کے کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے بھاگ نکلے۔ اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ۔ پھر ان کو زندگی عطا فرمائی۔ بے شک اللہ لوگوں کے اوپر بڑا احسان کرنے والا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس کا احسان نہیں مانتے۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے:

یہ ایک واقعہ کا بیان ہے۔ جو کسی جماعت پر کسی زمانہ میں گزرا تھا۔ چونکہ ایسے واقعات مختلف قوموں کی مختلف زمانوں میں گزر سکتے ہیں اس لئے نہ اس جماعت کی جستجو کی ضرورت ہے نہ اس زمانہ کی تلاش کی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ایک قوم موت کے خوف سے اپنے گھر بار اور مال و منال کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں اللہ نے ان کے لئے چارہ کار یہ تجویز فرمایا کہ "مر جاؤ"، چنانچہ اسی علاج سے وہ پھر زندہ ہو گئے۔ "مر جاؤ" کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں جان دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس حکم کا یہ مفہوم اگلی آیت سے واضح ہو جاتا ہے جس میں فرمایا ہے کہ

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو"

یعنی ان لوگوں سے کہا گیا کہ تم جو دشمنوں کے خوف سے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر بھاگ آئے یہ تمہاری کمزوری تھی۔ لہٰذا ہمت کرو، اور ان کے مقابلہ میں جان دینے اور لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پھر اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اپنے فضل سے تم کو کامیاب کر دے گا۔ وہ تمہاری پکاریں سننے والا اور تمہارے کاموں کی خبر رکھنے والا ہے۔

قوموں کے اوپر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ پریشانی اور بدحواسی میں ان کا لوگ خوف

؎ قرآن کے بعض مفسروں نے ان آیات کی یہ تفسیر کی ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت وبا کے ڈر سے گھر بار چھوڑ کر نکلی تھی۔ اللہ نے ان کو حکم دیا کہ "مر جاؤ" وہ سب کے سب مر گئے۔ ایک زمانہ کے بعد حضرت حزقیل نبی کا اس وادی میں گزر ہوا۔ جہاں ان کی سڑی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں، ان کی دعا سے یہ سب کے سب زندہ ہو گئے لیکن یہ قرآن فہمی نہیں ہے، کیونکہ اولاً تو موت کے معنی وبا کے نہیں ہیں۔ ثانیاً اگر وہ وبا کے ڈر سے بھاگے تھے اور ان کی سزا موت تھی تو "مر جاؤ" کا حکم اللہ نہ دیتا۔ بلکہ یہ فرماتا کہ ہم نے ان کو مار دیا۔ جیسا کہ اس کے آگے حضرت عزیر کے متعلق فرمایا ہے فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ۔ علاوہ بریں ان کو غیر فطری طور پر زندگی بخشنے میں کیا مصلحت اور کونسی تعلیم مقصود تھی؟ پھر قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کے حکم کو جو دراصل "مُوْتُوْا" کی تفسیر ہے اس واقعہ سے الگ کر کے اس کا مخاطب امت محمدیہ کو قرار دینا سیاق و سباق کے بالکل ہی خلاف ہے۔ یہ حکم انہیں بھاگنے والوں کو دیا گیا تھا۔ اور یہ پورا واقعہ ہماری ہدایت کے لئے بیان ہوا ہے۔

سمجھا جاتا ہے۔ اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور وہ جان لے کر بھاگ نکلتی ہیں
ایسی حالت میں قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو ہمت کرکے اللہ کے بھروسہ پر جان دینے اور جہاد کرنے کے
لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ پھر اللہ ان کو زندگی یعنی ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا کر دے گا۔

ایسی قوموں میں جو لوگ دولت والے ہوں ان سے اللہ فرماتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ
وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝

وہ کون ہے جو اللہ کو خوشدلی سے قرض دے تو اللہ اس کو اس کے لئے کئی گنا بڑھائیگا
اور اللہ ہی تنگی و فراخی دیتا ہے۔ اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے!

پہلے جان دینے کا حکم دیا۔ کیونکہ دنیا میں جو قوم جان دینے کے لئے تیار نہ ہوگی وہ اپنے دین و ناموس کو
محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دشمنوں سے لڑنا یا ان پر چڑھائی کرنا بے ساز و سامان کے ہو نہیں
سکتا جس کے لئے مال کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہایت خوش اسلوبی سے جہاد میں خرچ کی ترغیب دی
کہ جو کچھ اس میں دو گے وہ اپنے مالک کو قرض حسنہ دو گے جس کا کئی گنا وہ تم کو لوٹے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ غنی اور بے نیاز ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کے
سارے خزانے ہیں۔ اس کو قرض کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کو قرض سے
اس لئے تعبیر کیا کہ اس کے اوپر ایمان رکھنے والے بندے یہ یقین رکھیں کہ ہمارا مال جس کو ہم اس کی راہ
میں خرچ کریں گے رائگاں نہیں جائیگا۔ بلکہ کئی گنا منافع کے ساتھ ہم کو دونوں جہان میں ملے گا۔ اور
جو لوگ اس کی راہ میں اپنا مال خرچ نہ کریں گے وہ اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ ان کی دولت بچی رہیگی
کیونکہ اللہ کسی قسم کی آفت یا مصیبت ڈال کر ان کو محتاج کر سکتا ہے۔ بالخصوص اگر قوم کی اجتماعی
حالت ان کے بخل سے بگڑ گئی تو وہ کیونکر تباہی سے بچ سکتے ہیں۔ اس لئے اس نے ظاہر کر دیا کہ فراخ
دستی اور تنگ دستی دونوں اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ

لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ
أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا
مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ○

کیا تو نے بنی اسرائیل کے سرداروں کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جو موسیٰ کے بعد تھے۔ جبکہ انہوں نے اپنے زمانہ کے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو کہ ہم (اس کے زیر حکم) اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے جواب دیا کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا گیا تو تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ نہ لڑو۔ کہنے لگے کہ بھلا ہم کیوں نہ لڑیں گے۔ ہم تو اپنے گھروں اور بال بچوں سے نکال دیئے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو سوائے چند کے سب پھر گئے۔ اور

اللہ ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے!

بعض لوگوں نے اس واقعہ کو اس سے پہلے واقعہ سے جداگانہ خیال کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اسی کی تفصیل ہے۔ کیونکہ پہلے بھی یہی بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔ اور اس میں بھی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔ پہلے میں ان کو حکم دیا گیا کہ "مرجاؤ" یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں جان دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس میں وہ مقابلہ کے لئے آمادہ ہو کر اپنے پیغمبر سے ایک سالار مقرر کرنے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ اس کی ماتحتی میں جنگ کریں۔ نبی نے ان کے لئے بادشاہ منتخب کر دیا۔ لیکن ان کی بزدلی اور پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ بھی ظاہر کر دیا کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے گا تو تم جی چراؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر اجاڑ دیئے گئے اور بال بچے تباہ کر دیئے گئے۔ کیا ہم اس قدر بے غیرت اور بے حمیت ہیں کہ اب بھی نہیں لڑیں گے۔ لیکن آخر وہی ہوا۔ یعنی جب حکم دیا گیا کہ فلاں شخص تمہارا بادشاہ ہے۔ اس کے ساتھ جاؤ اور دشمنوں کا مقابلہ کرو۔ تو چند گنتی کے آدمیوں کے سوا سب نے منہ موڑ لیا۔ لیکن اللہ سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی، وہ جانتا تھا کہ کون لوگ خود اپنی تباہی کا راستہ اختیار کریں گے!

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا۔ وہ بولے کہ اس کو ہم پر بادشاہی کا حق کہاں سے ہے۔ اس سے زیادہ تو بادشاہت کے ہم خود مستحق ہیں۔ اس کے پاس تو مال کی بھی فراخی نہیں ہے۔ پیغمبر نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کو اللہ نے تمہارا بادشاہ منتخب کیا ہے۔ اور اس کو علمی اور جسمانی بزرگی بخشی ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت دینے والا اور جاننے والا ہے۔

نبی نے جب ان سے کہا کہ تمہاری درخواست کے مطابق طالوت تمہارا بادشاہ مقرر کیا گیا تو ہمت ہاری ہوئی قوم کے لوگوں نے حیلہ جوئی اور جنگ سے جان بچانے کا بہانہ نکالنے کے لئے یہ اعتراض اٹھایا کہ وہ نہ بڑے گھرانے سے ہے نہ اس کے پاس مال ہے۔ ہم کیسے اس کو اپنا بادشاہ مان لیں۔ نبی نے جواب دیا کہ وہ میری رائے سے بادشاہ نہیں ہوا ہے کہ میں اس پر پھر غور کر سکوں۔ اس کو تو اللہ نے مقرر کیا ہے جس میں چون وچرا کی کوئی گنجائش نہیں۔ یوں بھی ظاہری طور پر وہ تم سب سے عالم، سپہ گری میں ماہر، جسیم وجمیل اور قوی ورعب دار ہے۔ اور ملک تو دراصل اللہ کا ہے وہ جس کو چاہے دے، وہ وسیع بخشش والا ہے اور خوب جانتا ہے کہ کون اس بخشش کا اہل ہے۔ نبی سے یہ باتیں سن کر اب انہوں نے طالوت کے من جانب اللہ بادشاہ مقرر کئے جانے کا ثبوت طلب کیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝

اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ اس کی بادشاہت (من جانب اللہ ہونے) کی علامت یہ

کر تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین اور
آل موسیٰ اور آل ہارون کے ترکہ کی کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے
اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے یقیناً ایک کھلی نشانی ہے

یہ نشانی[1] آگئی اور آخر کار ان لوگوں نے طالوت کی بادشاہت تسلیم کی۔ اور اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر جنگ کے لئے تیار ہوئے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ
مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً
بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ
يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللّٰهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً
بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ○

جب طالوت فوجوں کو لے کر روانہ ہوا تو کہا کہ اللہ دریا پر تم کو آزمانے گا۔ جو اس کا پانی پی لیگا وہ میرا ساتھی نہیں۔ اور جو اس کو نہ چکھے وہ میرا ہے۔ ہاں جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو

---

[1] بنی اسرائیل کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے گھرانوں کے بچے ہوئے کچھ تبرکات ایک صندوق میں بطور یادگار محفوظ تھے۔ جس کا نام تابوت سکینہ تھا۔ اس کی برکت سے وہ لڑائیوں میں قوی دل اور فتح کے امیدوار رہتے تھے۔ اس ہزیمت میں جو انہوں نے اپنے دشمن فلسطینیوں کے مقابل اٹھائی تھی اس تابوت کو دشمن چھین لے گئے تھے۔ مگر قضائے الٰہی سے ایسا ہوا کہ وہ اپنی جس بستی میں اس کو لے کر پہنچے وہاں وبا پھیل جاتی۔ انہوں نے خیال کیا کہ جب تک یہ صندوق ہمارے ساتھ ہے ہم کو وبا سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس لئے اس کو ایک گاڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کی سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔ قدرت الٰہی کے فرشتے اسکو اسرائیلی بستی بیت الشمس میں لے آئے۔ بنی اسرائیل نے جب اس کو دیکھا تو اتار کر لائے اور بڑی خوشی منائی۔

اٹھا کر پی لے (تو کوئی مضائقہ نہیں) ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب نے پی لیا
پھر جب طالوت اور وہ مومن جو اس کے ساتھ تھے دریا کے پار پہنچے تو (دشمنوں کی کثرت کو دیکھ کر)
بول اٹھے کہ آج ہم جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر جن کو یقین تھا کہ اللہ
سے ہم کو ملنا ہے۔ کہنے لگے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب
آگئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فوج کے لئے ایمان اور یقین کے بعد سب سے ضروری چیز امیر کی اطاعت اور نظام کی پابندی ہے۔ طالوت نے پہلے ہی مرحلہ میں اپنی جماعت کا امتحان لیا کہ راستہ میں دریا پڑا تو حکم دیا کہ کوئی اس کا پانی نہ پیئے۔ مگر بہتوں نے پی لیا۔ اس حکم عدولی پر ان کو فوج سے نکال دیا۔ اور اپنے ساتھ صرف انہیں لوگوں کو رکھا جو حکم کے مطیع اور نظام کے پابند نکلے۔

عام انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ دشمنوں کی اپنے سے زیادہ کثرت تعداد کو دیکھ کر ہراساں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی جب غنیم کی تعداد بے شمار دیکھی تو بول اٹھے کہ اس انبوہ سے ہم کیونکر مقابلہ کر سکیں گے

اس خوف کا علاج صرف ایمان کی پختگی اور اللہ سے ملنے اور اس کے پاس پہنچنے پر یقین رکھنا ہے یہی وہ چیز ہے جو جہاد کو عزیز ترین عمل بنا دیتی ہے، اور مؤمنوں کو اسی لقاء الہیٰ کی تمنا کے سوز اور بیتابی سے قدرت کے کرشمے اور فتح و نصرت کے فرشتے اترتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

در معرکہ بے سوز تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی (اقبال)

پس کر طالوت کی اس قلیل جماعت میں جو مومن بندے تھے کہنے لگے کہ فتح کے لئے تعداد کی کثرت اور قلت کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ان کو ملتی ہے جن کا اللہ ساتھ دیتا ہے اور وہ انہیں لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو معرکہ میں دشمنوں کے مقابلہ میں صبر سے کام لیتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں[1]۔

---

[1] یہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آ گئے تو کہنے لگے۔ اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر انڈیل دے۔ اور ہمارے پاؤں جمائے رکھ۔ اور ہم کو کافروں کی قوم پر فتح دے

مومن اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے اسی سے مدد طلب کرتے اور اسی کی مہربانی سے دشمنوں کے مقابل میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور میں نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قدرت آخر کار وہ اپنی طاقت سے نہیں بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی قوت اور اسی کی نصرت سے فتح یاب ہوتے ہیں۔

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

پھر انہوں نے اللہ کے حکم سے دشمنوں کو شکست دیدی۔ اور داؤد نے جالوت کو مار لیا۔ اور اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکمت عطا فرمائی اور جو باتیں وہ چاہتا تھا اسکو سکھائیں اور اگر اللہ ایک قوم سے دوسری قوم کو مٹاتا نہ رہے تو دنیا کا نظام بگڑ جائے لیکن اللہ دنیا والوں پر مہربانی کرنے والا ہے۔

تھوڑے سے آدمی تھے انہیں بھی پختہ ایمان والے کم اور دشمن بے شمار، لیکن اللہ نے انہیں تھوڑے سے سچے بندوں کو فتح بخشی، اور حضرت لیسی کے نوعمر بیٹے حضرت داؤد نے فلسطینیوں کے سردار

گزشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ دیکھئے

لہ مہلب بن ابی صفرہ جو عہد بنی امیہ کا نامور سپہ سالار تھا جس نے خوارج کا خاتمہ کیا اور کسی معرکہ میں شکست نہیں کھائی اس سے کسی نے پوچھا کہ "بہادری کیا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "صرف ایک گھڑی کا صبر۔ جب دشمن ٹوٹ پڑیں اور میدان کارزار گرم ہو اس وقت آدمی تھوڑی دیر ثابت قدم رہ جائے۔"

جالوت کو قتل کر دیا۔ آخر میں اللہ نے ان کو بادشاہت اور بادشاہت کے ساتھ نبوت بھی عطا فرما دی[1]

مذکورۂ بالا پورے واقعہ میں اللہ نے طالوت اور جالوت اور ان کے باہم مقابلہ اور مقاتلہ اور ایمانداروں کے صبر و ثبات کا ذکر کر کے جہاد کی غرض بھی بیان فرما دی کہ اس سے کمزوروں کو زور آوروں کے ظلم سے بچانا اور مفسدوں کے شر کو دفع کرنا مقصود ہے۔ اگر ایک قوم کے ذریعہ سے دوسری بگڑی ہوئی قوم کا تختہ نہ اُلٹ دیا جائے تو روئے زمین پر بھی فساد پھیل جائے اور عالم کا نظام تہس نہس ہو جائے۔ قرآن کریم کی پہلی آیت جس میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی اس میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں ان کو بھی لڑنے کی اجازت دی گئی۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس کہنے پر کہ ہمارا رب (اکیلا) اللہ ہے۔ اور اگر اللہ ایک قوم سے دوسری قوم کو مٹاتا نہ رہے تو خانقاہیں۔ گرجے، عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے ویران کر دی جائیں گے۔ اور اللہ ان کی ضرور مدد کرے گا۔ جو اس (کے دین) کی مدد کریں وہ قوت والا اور زبردست ہے۔

اس آیت میں اللہ نے مظلوم مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی اور اس کی وجہ بھی ظاہر فرما دی کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور یہ وعدہ بھی فرمایا کہ ہم ضرور ان کی مدد کریں گے۔ ان کی مظلومی کی حالت تو یہ ہے کہ وہ صرف

---

[1] حضرت داؤد پہلے بادشاہ ہیں جو نبی ہوئے۔ یا پہلے نبی ہیں جو بادشاہ ہوئے۔ ان سے قبل یہ دونوں منصب کسی ایک شخص میں جمع نہیں ہوئے تھے۔

اس "جرم" پر اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں کہ اکیلے اللہ ہی کو اپنا پروردگار مانتے ہیں، اور کسی کو اس کا شریک نہیں گردانتے۔ اس کے بعد اپنا یہ دستور بھی بتلا دیا کہ ہم ایک قوم سے دوسری قوم کو مٹاتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو نہ گذشتہ انبیاء کے عبادت خانے قائم رہیں، نہ مسلمانوں کی مسجدیں باقی رہ جائیں۔

یہ وعدہ کہ اللہ مومنوں کو غلبہ عطا فرمائے گا قرآن میں بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ سورۂ مجادلہ کے آخری رکوع میں ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

اس کے آگے مومنوں کے بارے میں کہا ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ

یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہے گی۔

سورۂ صافات کے آخری رکوع میں ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ، اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔

اور ہمارے بندے رسولوں کے لئے پہلے ہی ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان کو مدد دی جائے گی۔

اور ہمارے ہی لشکر غالب رہیں گے۔

حقائق و عبر

راتکے شہباز جب آفتاب جہاں تاب اپنی کرنوں کے تلفلے کے ساتھ دوسری دنیا کی طرف ضو فشانیوں کے لئے منتقل ہو جاتا ہے تو چمگادڑیں، جو دن بھر کونوں اور کھدروں میں منہ چھپائے پڑی تھیں پھڑپھڑاتی ہوئی باہر آجاتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں کہ اب اس ظلمتکدہ میں ان ہی کا راج ہے۔ ان ہی "رات کے شہبازوں" میں سے ایک، ابوالکلام آزاد ہیں (آزاد! باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور دہ پا بگل) جب تقسیم ہند سے پہلے ان کی کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے کسی اجتماع میں آنا تو ایک طرف، سرراہے بھی کسی کو منہ دکھانے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ کلکتہ ان کا ایک گونہ وطن تھا، وہاں کے مسلمانوں نے انہیں عید کی امامت سے الگ کر دیا تھا۔ اب آخری دنوں حالت یہ ہو چکی تھی کہ ریل میں سفر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوائی جہاز کے ذریعے آتے جاتے تھے۔ اور اس طرح نگہ اعتبار کیلئے پیکر صد عبرت بنے ہوئے تھے جو زبان حال سے پکار رہا تھا کہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے

دیکھو اور سوچو کہ دنیا میں ملت فروشوں کی کیا حالت ہوتی ہے — !

ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن۔

لیکن جب مسلمان پاکستان کی طرف منتقل ہو گئے تو یہ صاحب جھٹ باہر آگئے اور پھر جلوہ بار محراب و منبر ہونے لگے۔ چنانچہ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں انہوں نے جامع مسجد دہلی میں ایک تقریر

فرمائی جس کے دوران میں مسلمانوں سے ارشاد ہوا۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے خلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے دشمن کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے...... تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں..........

(بحوالہ آزاد۔ لاہور ۸ر نومبر ۱۹۴۷ء)

یہ تو ہوا مطلع۔ اب مقطع ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوا۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کا ہی نتیجہ ہے...... لیکن تم چند فانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جلانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا...... عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

غور فرمایئے! ان چند الفاظ میں جناب آزاد کا پورا کیریکٹر کس طرح چھن چھن کر باہر آ رہا ہے اور یہ ان کے تحت الشعور میں مچلنے والی ناکام تمناؤں کی کس طرح سے غمازی کر رہے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں، لاہور کے مقام پر جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں، ان کے ہر مصرعہ کی تان اس مقطع پر ٹوٹتی تھی کہ تمام مسلمان ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ بس اسی میں ان کی تمام مصیبتوں کا حل پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان کے حاشیہ نشینوں نے انہیں امام الہند کے لقب سے مخاطب کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان ان کی اس امامت کبریٰ پر راضی نہ ہوئے تو ان کے سامنے چونکہ اپنی انانیت کے سوا اور کچھ نہ تھا اس لئے یہ فوراً مخالفین کے گروہ میں جا ملے، اور اس کے بعد مسلمانوں کے ملی مفاد کو جس قدر نقصان ان کے ہاتھوں سے پہنچا اس کے بیان کی آج ضرورت نہیں۔ اس کا حساب اللہ کی اس میزان

میں ہو جائے گا جس میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی غلطی نہیں ہوتی۔ اب پھر میدان خالی ہوا تو امامت کبریٰ کی ان ہی پامال تمناؤں اور ان گشتہ آرزوؤں نے کروٹ لی اور یہ سورج بن کر پھر مسلمانوں کے سامنے آپہنچے۔ یہ کیریکٹر بھی علم تجزیۂ نفس (Psycho Analysis) کے طالب علموں کے لئے دلچسپ مطالعہ کا موضوع ہے۔ اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب اور خود دہلی کے مسلمانوں پر جو قیامت گذری ہے اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ مصائب و آلام کے یہ سیلاب حکومت کی سازش سے آئے جس کے ایک رکن اعلیٰ جناب آزاد تھے۔ اس تمام دوران میں مسلمانوں کی ہمدردی اور غمگساری کا ایک لفظ ان کی زبان تک نہیں آیا۔ یہ وہی آزاد تھے جو کسی زمانے میں کہا کرتے تھے کہ۔

> پس اے عزیزان ملت اور اے بقیہ ماتم زدگان قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروان اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامی وطن کے حلقۂ بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیرؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدان جنگ میں کسی

> ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے، اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔
>
> (الہلال ۱۱/۱۲ ۱۹۱۳ء)

لیکن آج ان کی یہ حالت تھی کہ ترکی اور ایران یا افغانستان اور روس کے مسلمانوں پر نہیں۔ خود کشمیر کے مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے جا رہے تھے جن میں یہ بذاتِ خود تشریف فرما تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے، اس شنیری کے زور پر جس کے یہ پُرزے تھے، انتہائی سبعیت و بربریت سے مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا اور یہ اس سے لطف اٹھا رہے تھے اس لئے کہ اس سے ان کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو رہی تھی۔ انسانی کردار اپنی دنائت و تسفل کے انتہائی مقام تک اس وقت پہنچتا ہے جب وہ کسی کی مصیبت سے مزہ لے اور اس کی بے کسی و بیچارگی سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔ اس تصور کی یاد لے کہ مسلمانوں نے انہیں منتخب نہیں کیا عمر بھر انہیں نعل بر آتش رکھا اور جب وہ قتل گاہ دہلی میں خون کی ندیوں میں ڈبوئے جا رہے تھے تو یہ برمزم آرائے ساحل ہوئے اور اپنے جذبۂ انتقام کے جوش میں مست ہو کر ان سے کہا:۔

> تمہیں یاد ہے۔ میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دئیے۔ میں نے چلنا چاہا اور تم نے میرے پاؤں کاٹ دئیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو آج تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی تمام سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم! کہ آج انہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

.........سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو!

"دیکھ لیا میں کیا کچھ کرا سکتا ہوں! کہو! اب بھی مجھے "خلیفۃ اللہ فی الارض" مانتے ہو یا ہنوز کچھ کسر باقی ہے!!"

اللہ اکبر! انسان بھی کیا مجموعہ اضداد ہے۔ اس کی بلندیوں کی طرف نگاہ اٹھاؤ تو اسے فرشتے سجدہ کرتے دکھائی دیں اور اس کی پستیوں کو دیکھو تو اس سے ابلیس بھی شرمائے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَؕ اسی تقریر میں جناب آزاد نے فرمایا تھا کہ وہ نومبر میں اپنے ہم نواؤں کا ایک اجتماع طلب کر رہے ہیں۔ اس میں بتایا جائے گا کہ ہندوستان میں البقیۃ السیف مسلمانوں کو کس نہج و اسلوب سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس کانفرنس میں عوام کو جس صراط مستقیم کا سراغ بتایا گیا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود جمعیت العلماء ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب آزاد نے فرمایا کہ

> ہندوستان میں جمعیت جیسی جماعت کے لئے گنجائش ہے۔ لیکن اسے اپنی مساعی کو مسلمانوں کے ثقافتی اور مذہبی مفاد کے تحفظ تک محدود رکھنا ہوگا اور آئندہ سیاسی امور میں کبھی دخل نہیں دینا ہوگا۔ اب آزاد ہند جدید میں، مسلمانوں کو تمام معاملات کو غیر فرقہ وارانہ بنظر اقتصادی زاویہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔ انڈین نیشنل کانگرس اسی قسم کی غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو فی الفور کانگرس میں شامل ہو جانا چاہیئے۔
>
> (قرآن ۱۴/۱۱ ۱۵)

یہ مشورہ کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ لیکن اصل دلچسپی کا مقام وہ ہے جہاں انہوں نے فرمایا کہ

> گذشتہ چالیس برس سے میرا یہی پیغام چلا آ رہا ہے اور مسلمانان ہند کے لئے میرا آج بھی یہی مشورہ ہے۔

جناب آزاد ہمیشہ اپنے چالیس سال پیشتر کے مسلک کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ اس کی بھی ایک نفسیاتی لم ہے۔ چالیس سال پہلے کا وہ زمانہ تھا، جب یہ صاحب مسلمانوں میں بے حد مقبول تھے۔ اب اس

زمانہ کی طرف اشارہ کرنے سے اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میرا مسلک وہی ہے جس کی بنا پر تم لوگوں نے مجھے اپنے دلوں میں جگہ دے رکھی تھی۔ اس لئے اگر اب میں تمہاری نگاہوں میں ذلیل ہوچکا ہوں تو اس کی وجہ میرے مسلک کی تبدیلی نہیں (اس لئے کہ میرا مسلک تو وہی ہے جو اُس وقت تھا)۔ اسکی وجہ تمہاری غلط بینی اور نگاہ فریبی ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی چہار سالہ زندگی میں جناب آزاد کے اس کھلے ہوئے فریب کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور ان کے موجودہ مسلک اور اس مسلک کی ہر شق کے متعلق، ان کے دورِ الہلال کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات سے ثابت کر دیا کہ آپ کا مسلک اور اس زمانہ کے مشرب میں بعد المشرقین ہے۔ جو چیز اس وقت ان کے نزدیک کفر اور شرک تھی آج عین ایمان و اسلام ہے۔ حتیٰ کہ طلوعِ اسلام نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ انہوں نے آیاتِ قرآن کے ترجمہ تک میں اب تبدیلی کر دی ہے اور اس طرح وہ تحریفِ قرآنی کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہونے سے بھی نہیں شرمائے۔ اس وقت انہوں نے جمعیت العلماء کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے دائرہ حرکت و عمل کو مذہب کی حدود تک مقید رکھیں اور سیاست میں کوئی دخل نہ دیں اور بتایا یہ ہے کہ ان کا یہی مشورہ چالیس سال سے چلا آرہا ہے۔ اب دیکھئے کہ چالیس سال پہلے اس باب میں ان کا کیا عقیدہ تھا۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا۔

> ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیم بنگال کی تنسیخ سے نہیں بلکہ پیشتر سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبانہ پالیسی کا ولولہ رکھتے ہیں۔ گو عام راہ ضلالت سے الگ رہنے کا انہیں الاؤنس دینا چاہیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے سامنے بھی ہندوؤں کی پولیٹیکل جد وجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہیٰ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں۔ بے شک ہمارے عقیدے میں بھی آجکل مسلمانوں کے لئے عبرت اور تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے۔ اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی۔ لیکن پیروانِ "امام مبین" کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت

نہیں ہوسکتی کہ اعمال زندگی کے ایک ضروری شعبے میں ان کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور ولاچار ہوگیا ہو۔ اور اس کی طرف سے مایوس ہوکر انہیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر للچانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایک ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بستر نزع پر سورۂ یٰسین کو دہرا دینے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے! ہمارے نزدیک اسلام کے دامن تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہوسکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں...... پس اگر مسلمان زندگی حاصل کرسکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بن کر نہیں۔ اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فرض کر لیجئے کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی۔ جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں ان میں تغیر وتبدل ہر وقت ممکن ہے۔ البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لاتبدیل لکلمات اللہ۔ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے۔! ذرا غور سے کام لیجئے، کہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو لیکن وہ ایسی راہ پیدا کرلیں جو ان کی مستقل اور مخصوص راہ ہو۔ جس میں کبھی تغیر کی ضرورت نہ ہو۔ تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہو۔ نیز کہا جاسکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے...... ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کرکے زندگی کی حرارت پیدا کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو علیحدہ کوئی قومیت نہیں جو کسی خاص نسل وخاندان یا دین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب، یا بالفاظ مناسب قرآن کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے اس وقت تک ان میں نہ قومیت

کی روح پیدا ہو سکے گی، اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں اپنے لئے جو تاثیر رکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہکر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلے میں اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا" یا "اسلام" ہے۔......... (الہلال)

(۱) مسلمانوں کے لئے ہر شے اُن کے مذہب میں ہے۔ پس وہ اگر آجکل اپنی پولیٹیکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اس شے ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف پالیٹکس، بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کرتے۔

(۲) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لئے نازل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل اور اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔

(۳) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ اسلام ہی ان کے لئے پالیٹکس کی راہ کھولے گا، تعلیم کا حکم دیگا اخلاق و فضائل میں تبدیلی پیدا کر دے گا۔ اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں، نقصانوں اور مضرتوں سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

(۴) تعلیم، معاشرت اور سیاست میں ان کو بر بنائے اتباع اقوام کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بر بنائے مذہب۔

(الہلال - ۹ر اکتوبر ۲۹ر اکتوبر، ۶ر نومبر سنہ ۱۹۱۲ء)

اور سنئیے۔ اسی زمانہ میں جناب آزاد کو کسی نے خط لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ پولیٹیکل مباحث مذہب سے الگ ہونے چاہئیں۔ اس خط کا جواب الہلال کے صفحات پر ان الفاظ میں دیا گیا۔

> آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے۔ لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے، ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب سے سیکھے ہیں وہ مذہبی رنگ میں ہی نہیں۔ بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں۔ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفر صریح ہے۔ اور پالیٹکس بھی اسی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ ورنہ اپنی پولیٹیکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس سے سب کچھ سیکھ سکتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لیکر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی تعلیم توحید میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی دینی ہو یا دنیاوی۔ حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقہ درس ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھدیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین، تبیاناً لکل شیء، بصائر للناس، ہادی وہادی الی السبیل، جامع احزاب و امثال، بلاغ للناس، حاوی بحر و بر اور اسی طرح

> کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے، اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو، خواہ سیاسی ...... ہماری پولیٹیکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست رہنما کو اب تک اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی ...... پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے ایک ضروری شعبے یعنی سیاسی اعمال کے لئے دوسروں کے دروازے کے سائل بنیں۔ حالانکہ خود قرآن ان کے پاس ایک حکم اور ایک امام مبین ہے (الہلال - ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء)

اس زمانہ میں مذہب کو سیاست سے الگ کر دینے کا نام، ان کے نزدیک کفرِ صریح اور شرکِ جلی تھا۔ ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیوشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں سیاسی تقریریں کرنے کی اجازت نہیں۔ اس پر جناب آزاد نے الہلال کی چار اشاعتوں میں افتتاحی مقالات میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا کہ اسلام میں مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا کفر و شرک ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس ضمن میں لکھا۔

> میں اگر ان کو کفر پرست کہوں تو تم کہو گے کہ یہ ایمان و کفر کی بحث ہے۔ میں اگر ان کو شرک کہوں تو تم پکارو گے کہ یہ بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ ہاں یہ جسارت ہے لیکن جن ظالموں نے اللہ کے آگے جسارت کی ہے کیوں نہ ہم بھی ان کے لئے جسارت کریں۔ وہ نہ مومن ہیں نہ مسلم، ان کا حال یہ ہے جو کہا گیا نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا۔ ان لوگوں کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست اور پالیٹکس کہتے ہیں اسلام کے نزدیک عین دین و مذہب ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ...... (الہلال۔ بابت ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

اس لئے کہ۔

> حضرت ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام عالم کی ضلالتوں اور تاریکیوں کو

دور کرنا چاہا اور اپنی اور اپنی جماعت مقدس کی زندگی اسی راہ میں صرف کر دی۔ یہ محض اصلاح اقوام ہند میں کا کوئی خاص شعبہ نہ تھا جس کو تم نے پالیٹکس، تمدن، اخلاق اور مذہب کے نام سے تقسیم کر دیا ہے بلکہ ان کی دعوت عام اور ان کی اصلاح عالمگیر تھی۔

(الہلال۔ بابت ۹ ہر اکتوبر ۱۳ ۱۹ء صفحہ)

باقی رہا کانگرس میں شرکت کا سوال، تو یہ چیز جناب آزاد کے نزدیک اس زمانہ میں ایسا شرک تھا جس کی کبھی معافی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جس خط کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا

آپ پوچھتے ہیں کہ آجکل ہندوؤں کے دو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں۔ ان میں سے آپ کس کے ساتھ ہیں؟ گذارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کیلئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں، وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔ اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے آگے کھڑی ہو جائے گی، ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے۔ راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں، وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت (والغیرۃ من شان حضرۃ الربوبیۃ) اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴: ۱۱۶) .... پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالیٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہو جئے! صرف اس راہ پر چلئے جو کہ اسلام کی

بتائی ہوئی صراط المستقیم ہے ۔ .... (مضامین آزاد حصہ دوئم)

یہ تھا جناب آزاد کا چالیس سال پیشتر کا مسلک جس کی رو سے

(۱) سیاست کو مذہب سے الگ رکھنا شرک جلی تھا۔ ناقابل عفو۔

(۲) ہندوؤں کی کسی جماعت میں شرکت کفر صریح تھا اور خدا کی غیرت کو جوش میں لانے کا موجب۔

(۳) مسلمان اپنی الگ مستقل قومیت رکھتے تھے جو نسلی اور وطنی حدود سے بے نیاز تھی

(۴) ان کے لئے اسلامی زندگی یہ تھی کہ وہ اپنی جماعت میں شامل ہو کر، قرآن کو اپنا شاہراہ مقصود بنائیں۔

اور یہ ہے آج کا مسلک جس کی رو سے:۔

(۱) مذہب کو سیاست میں دخیل سمجھنا جرم عظیم قرار دیا جا رہا ہے۔

(۲) مسلمانوں کو اس جماعت میں شمولیت کی تلقین کی جا رہی ہے جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے (بلکہ وہ ہے ہی ہندوؤں کی جماعت)

(۳) مسلمانوں کو وطنی حدود کی بنا پر متحدہ قومیت کا جزو قرار دیا جا رہا ہے، اور

(۴) ان کی الگ جماعت کا نام فرقہ دارانہ جماعت رکھ کر اسے سخت قابل نفرت شے قرار دیا جا رہا ہے

اور اس کے باوجود اعلان یہ فرمایا جا رہا ہے کہ میرا آج بھی وہی مسلک ہے جو چالیس سال پہلے تھا۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

ہم جناب آزاد کے ان "ارشادات" کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھتے۔ لیکن، جیسا کہ ہم نے لمعات میں لکھا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بسنے والا مسلمان زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک غلط قدم اسے، قرآنی لفظ نگاہ سے تباہیوں اور بربادیوں کے خوفناک جہنم کی طرف

لے جائیگا۔ لہذا اس وقت نہایت ضروری ہے کہ انہیں ان غارتگرانِ متاعِ ملت کی روباہ بازیوں اور حیلہ کاریوں سے آگاہ کر دیا جائے جو نہایت معصومانہ انداز میں ناصحین مشفق کا نقاب اوڑھ کر ہماری اور چارہ سازی کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوؤں اور ان کی بساطِ سیاست کے اس منتہم کے مہروں کی منظم سازش نے وہ تمام فسادات برپا کئے جن میں مسلمانوں کو بُری طرح سے تباہ کیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مسلمان پاکستان سے بددل ہو جائیں اور خوف و دہشت کے مارے یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی ہم غلطی پر تھے۔ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کے اجزا بنے رہتے اور ملک کی تقسیم نہ ہوتی تو ہم پر کبھی یہ قیامتیں برپا نہ ہوتیں۔ چنانچہ جناب آزاد نے اپنی اکتوبر ۱۹۴۷ء والی محولہ صدر تقریر میں نہایت بلند آہنگی سے کہا کہ

متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا اور اب اس کی یاد کو اس لئے دہرایا جا رہا ہے۔ کہ ہندوستان (بلکہ خود پاکستان) کے مسلمانوں کے دل میں پاکستان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے جائیں اور اس طرح ان کے یقین کو ریب و تذبذب میں بدل دیا جائے، کہ قوموں کی موت فقدانِ یقین سے ہوتی ہے۔ حصولِ پاکستان کی جنگ میں شکست خوردہ گروہ مخالف کی یہ بہت بڑی سازش ہے اور یہی وہ سازش ہے جس سے آگاہ کرنے کیلئے ہم نے یہ کچھ لکھا ہے۔ اور عند الضرورت اس کے بعد بھی لکھتے رہیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ یاد رکھئے!

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی صراطِ مستقیم ہے جس پر چل کر وہ آبرومندانہ زندگی اور اس کے ثمرات و برکات سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔ اور وہ راہ اس کے سوا اور کونسی راہ ہو سکتی ہے جسے ان کے خدا نے ان کے لئے تجویز کر دیا اور ان کے رسولؐ نے اسے عملاً متشکل کر کے

دکھایا۔ یعنی تمام مسلمان بلا اختلاف نسل و رنگ و زبان و وطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک ملت کے افراد ہیں۔ اور جماعتی زندگی ہی اسلامی زندگی ہے اور ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین اور یہی مسلمانوں کی راہ ہے ومن یتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیراً۔ اور جو شخص مومنین کی راہ کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار کرے گا تو ہم اس کا تعلق ان ہی کے ساتھ کر دیں گے جن سے وہ اپنا تعلق جوڑتا ہے۔ اور یہ جہنم کی راہ ہے جس میں اسے داخل کریں گے اور وہ کس قدر بری جگہ ہے رہنے کی۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے اس کانفرنس کی روداد آئی جو دسمبر کے آخر میں ہندوستان کے قومیت پرست مسلمانوں نے جناب آزاد کے زیر صدارت منعقد کی۔ اس کانفرنس میں ان ہی باتوں کو دہرایا گیا جو جناب آزاد اس سے پیشتر فرما چکے تھے اور جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ البتہ دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے نائب صدر جناب مولانا احمد سعید صاحب نے ایک ریزولیشن پیش کیا جس میں یہ کہا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہوا ہے اس کا ذمہ دار مسلم لیگ کا فرقہ وارانہ نظریہ سیاست ہے، ہندو نہیں۔ اس ضمن میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ ایک زمانہ تھا جب یہی مولانا " صاحب فرمایا کرتے تھے کہ

> اسلامی حکومت کے زوال پر اگر خدانخواستہ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی؟
>
> (الجمعیت بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۔)

ہم جناب مولانا سے عرض کریں گے کہ ہندوؤں نے حکمران ہو کر بعینہٖ وہ کچھ کیا ہے جس کی طرف آپ نے بیس سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ یہ قوم بھی وہی ہے۔ مسلمان بھی وہی ہیں۔ لیکن آپ وہ نہیں ہیں۔ اگر آپ بھی وہی کچھ ہو جائیں تو پھر حقیقت کے اعلان کی جرات اسی طرح نصیب ہو جائے جس طرح بیس سال

آدھا مسلک تھی!

ان ہی "مولانا" صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست نے ہندوؤں کے خلاف بداعتمادی کے جذبات ابھار دیئے ہیں۔ (ڈان ۱۹ ۔ ۲۔ ۵۰) ہندو کس درجہ قابل اعتماد ہیں؟ اس کے متعلق ہم سے نہیں، ان واقعات سے جو ہر روز آپ کے سامنے ہو رہے ہیں، خود اپنے صاحب صدر (جناب آزاد) کی زبان سے سنیئے۔ ان کا ارشاد ہے۔

> کفار جو واقعات کو جھٹلاتے ہیں۔ حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں۔ نقض امن کرتے ہیں اور پھر اس کو لفظ امن کا لباس پہناتے ہیں قتل کرتے ہیں اور اسے جاں بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پیچ میں جبہ پہلک کو کچھ اور بتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطاعت منع ہے۔ ان کی فرمانبرداری جرم ہے۔ گناہ ہے۔ موجب عذاب ہے۔ اس قلادے کو توڑ دینا چاہیئے۔ اس اطاعت سے تبرّی فرض ہے۔ اس فرمانبرداری پر نافرمانی کو ترجیح ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ مسلمان مداہنت کریں۔ خوشامد کریں۔ ریاکاری کریں۔ منافقت کریں تو انہیں بھی اظہار نفاق کا موقع ملے۔ مگر خاکہو کہ مسلمانوں کے لئے یہ صورت کس قدر خطرناک ہے۔ کفار کے عہد و پیمان کا انہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے۔ اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر بوقت کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے کہ خبردار! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا۔ یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت سہارا لینے کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں، حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے

سرکشی ان کی خو ہے .... ۱؎ پھر ایسے لوگوں کی اطاعت کیونکر پسندیدہ ہو سکتی ہے۔ ان کو تو اپنے مال و اولاد کی فراوانی و کثرت یعنی فرط دولت و تکثیر آبادی کی وجہ سے اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ آیات قرآنی کو پرانے ڈھکوسلے کہنے لگے ہیں۔ (الہلال ۱۴-۱۱-۱۹۱۳ء)

سن لیا آپ نے کہ ہندو کس درجہ اعتماد کے قابل ہیں!

اس کانفرنس میں ایک اور مولانا صاحب (حفظ الرحمٰن سیوہاری) آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے ایمان وفاکیشی کے ثبوت میں یہاں تک فرما دیا کہ:

ہم مسلمانانِ انڈین یونین کے ایسے ہی وفادار شہری ہیں جیسے ہندو۔ اگر کسی بیرونی طاقت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہم اس کے خلاف جنگ کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ حتیٰ کہ اگر یہ حملہ پاکستان کی طرف سے بھی آئے گا تو ہم اسے بھی قبول کریں گے۔

(ڈان مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء)

ہم چاہتے تھے کہ جناب "مولانا" کو قرآن کی وہ نص صریح یاد دلا دیں جس میں کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کرنا جہنم کے ابدی عذاب کا مورد بنا دیتا ہے۔ لیکن ـــــ اس سے حاصل؟

دینِ او، آئینِ او سوداگری است ۔۔۔ عنتری اندر لباسِ حیدری است

پیشِ ازیں چیزے دگر مسجودِ او ۔۔۔ در زمانِ ما وطن معبودِ او

ظاہرِ او عشم دیں در دمند ۔۔۔ باطنش چوں دیریاں زنار بند

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است

ایں مسلمانے کہن ملت کش است

۱؎ یہاں آزاد صاحب نے کفار کو بداعمال اور حرام کار تک لکھ دیا ہے۔ ہم نے یہ حذف کر دیا ہے۔

۲۔ استقامت

کبھی وہ زمانہ تھا کہ ساری دنیا کے باشندے مسلمانوں کی سیرت و کردار کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھا کرتے تھے۔ آج وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہمیں غیروں کے واقعات زندگی کو اپنوں کے سامنے بطور نظیر و شہادت پیش کرنا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کی تحلیل و تجزیہ کی جائے تو ایک چیز من حیث القوم بطور قدر مشترک ملے گی۔ اور وہ ہے عدم استقلال۔ ان کے جذبات کو مشتعل کر کے ان سے کہئے تو ایک آن میں چین کی پوری دیوار کو ٹکر مار کر گرا دیں۔ لیکن اگر یہ کہئے کہ اس دیوار پر ہر صبح آ کر ایک لکیر کھینچ جایا کریں تو زیادہ سے زیادہ دو دن تک کوئی آئے گا، تیسرے دن شاید کوئی نہیں پہنچے گا۔ اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالئے یا ان کی گذشتہ بتیس چھتیس برس کی سیاسی تحریکات کو سامنے لائیے۔ یہ حقیقت بالکل واضح اور عیاں ہو جائے گی۔ کیا انفرادی اور کیا اجتماعی۔ دونوں زندگیوں میں کیفیت یہ کہ آندھی کی طرح اٹھتے ہیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اب اپنے مقابلہ میں ذرا اس فریق کو دیکھئے جس سے آپ کی مسلسل جنگ ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے واقعات کو چھوڑیئے اور ایک معمولی سے واقعہ کو لیجئے جو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۳ء کے ڈان میں شائع ہوا ہے۔ میٹریکولیشن کے بعد ایک طالب علم بنارس ہندو یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ لڑکا اس قدر غریب و نادار تھا کہ کالج کے اخراجات کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس کی غیرت نے بھیک مانگنا گوارا نہ کیا اور ایک اسکیم سوچی وہ دن بھر کالج میں پڑھتا اور شام کے بعد ایک رکشا لے کر اس میں کرایہ کی سواریاں بٹھاتا۔ اور آدھی رات تک یہی کچھ کرتا۔ آپ کو معلوم ہے اس کا یہ معمول کب تک جاری رہا؟ مسلسل چھ سال تک تاآنکہ اس نے ایم اے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ بظاہر یہ واقعہ بہت معمولی سا ہے لیکن اس کے اندر عبرت و بصیرت کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ قرآن نے جب اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ (جو لوگ اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے) کے ساتھ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے) کا اضافہ کیا تھا تو اس سے اس حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ قوموں کی زندگی کا راز یقین محکم اور عمل پیہم میں مضمر ہے۔ شعلوں کی طرح بھڑک اٹھنے والی جذباتی قومیں جلد راکھ کا ڈھیر ہو جایا کرتی ہیں۔ ایمان اور چٹان کی طرح محکم ایمان۔ عمل اور وقت کی روانیوں کی طرح

مسلسل عمل۔

جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

اگر ہمارے نوجوانوں میں کہیں استقامت کا جوہر کبریٰ پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے ان کی قوتِ بازو دنیا میں کیا انقلاب پیدا کرتی ہے۔

٭

۳۔ پیرِ نابالغ

جب فطرت کی ستم ظریفیوں سے زمامِ اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آجائے جس نے کبھی حکومت نہ کی ہو تو اس کی طرف سے اوچھے پن کی ایسی ایسی طفلانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ نہایت متانت و سنجیدگی میں بے ساختہ ہنسی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی اس قسم کے پیرانِ نابالغ کی کچھ کمی نہیں، لیکن سرحدِ پاکستان سے اس پار تو آئے دن اس قسم کی حرکات سامنے آتی ہیں جو اس افسردگی کے زمانے میں اچھی خاصی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں، حکومتِ ہندوستان کے وزیرِ اعظم، جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ

> میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں لڑائی چھڑ گئی تو دشمن کے ایک سپاہی کو بھی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ ہندوستان کی حدود میں قدم رکھے۔

(اسٹیٹسمین ۱۶)

یہ اجازت دینے کی بھی ایک ہی رہی! گویا جنگ چھڑنے پر پاکستانی فوج کے سپاہی ہندوستان کی سرحد پر پیغام کرا دیں گے۔ حضور پنڈت جی! اجی حضور صاحب!! آپ کہاں تشریف فرما ہیں؟ اگر اجازت ہو تو خاکسار اس لکیر سے آگے بڑھ آئیں۔ اور اگر جناب کی طبعِ نازک پر گراں نہ گذرے تو ذرا دہلی کی راجدھانی تک کی بھی سیر کر لیں۔ اور اگر بارِ خاطر نہ ہو تو لال قلعہ پر پھر سے مسلمانوں کا پرچم لہرا دیں۔ فرمائیے! کیا ارشاد ہے؟ ہم اجازت کے منتظر ہیں۔

ان بیچارے پنڈتوں اور بنیوں کو کیا معلوم کہ زبانِ شمشیر کن الفاظ میں گفتگو کیا کرتی ہے؟

یہ تو ماؤنٹ بیٹن کے سر کو دعائیں دیں جس نے ان کے ہاتھوں سے گھروندیاں اور ترازو چھڑا دیئے۔ ورنہ

انھیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ رسمِ شاہبازی

لیکن گلہ ان سے نہیں۔ گلہ ہے فطرت کی غلط بخشیوں سے، کہ

جہانِ خویش بہ سوداگراں داد

چہ داند لامکاں قدرِ مکاں را

ترانۂ پاکستان

قومی ترانہ، اپنی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے مشکل ترین صنفِ سخن ہوتا ہے۔ ہمارے شاعر اسد صاحب ملتانی کا خیال ہے کہ ترانہ کو اس قدر عام فہم اور آسان ہونا چاہیے کہ اسے عام جلسوں میں حتیٰ کہ بچوں کے اسکولوں تک میں بھی بلا دقت پڑھا جا سکے۔ اس خیال کے پیشِ نظر انہوں نے ترانے کے یہ چند اشعار موزوں فرمائے ہیں۔ انہیں یہاں بہ مقصد پیش کیا جا رہا ہے کہ ارباب نظر ان کے متعلق اپنی آراء سے مطلع فرمائیں۔ امید ہے کہ دیگر جرائد اس باب میں ہم سے تعاون کرتے ہوئے ان اشعار کو اس مطلب کے نوٹ کے ساتھ شائع فرمائیں گے

(مدیر طلوعِ اسلام)

سلامت قائدِ اعظم ہمارا — ہے جس کے دل میں درد و غم ہمارا
ملے ہم کو جہاں میں سربلندی — سدا اونچا رہے پرچم ہمارا
محبت نے ملائے دل ہمارے — رہے یارب یہی عالم ہمارا
ہماری کامیابی کا ہے ضامن — یقیں محکم، عمل پیہم ہمارا
غلامانِ رسولِ پاک ہیں ہم — نگہباں ہے خدا ہر دم ہمارا
خدا کے آستانے کے علاوہ — کہیں بھی سر نہ ہوگا خم ہمارا

چلے روباہ بیشک اپنی چالیں
اسد بے خوف ہے ضیغم ہمارا

اسد ملتانی

جوئے رواں

برادر مکرم، سلام مسنون

کونسا مسلمان ہے جو یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اس کے لئے دین و دنیا کی گراں بہا متاعِ عزیز قرآن کریم ہے لیکن کتنے مسلمان ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم سفرِ زندگی میں کونسی راہ دکھاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے مسلمان کو اس بات کا بہت کم احساس تھا کہ وہ معلوم کرے کہ قرآن کریم کس شاہ راہ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ لیکن آج اس کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔

یہی وہ احساس ہے جس نے یہ تڑپ پیدا کی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھا جائے۔ تڑپ پیدا ہو چکی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس تڑپ کی تسکین کا سامان میسر نہیں آتا۔

تسکین کے متلاشی چاہتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ قرآن کریم زندگی کے ان عملی مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے جو آج انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور جن کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے دنیا جہنم بن رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا آج زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ مشرق میں صدیوں کے جمود و تعطل سے بیزاری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ مغرب اپنی غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کے ہلاکت انگیز نتائج سے تنگ آ کر نظامِ زندگی کو جدید خطوط پر متشکل کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ غرضیکہ آج ساری دنیا ایک جہانِ نو کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دے رہی ہے جس میں فطرت کے صحیح مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ جہانِ نو، صرف قرآن کے اندر مل سکتا ہے۔ لیکن صرف اتنا دعویٰ ہی تو کافی نہیں۔ دنیا کا تقاضا ہے کہ اسے بتایا جائے کہ وہ نظام کونسا ہے جسے قرآن کریم شرفِ انسانیت کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ دنیا کو بتلانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم خود سمجھ سکیں کہ قرآنی نظامِ زندگی کیا ہے اور وہ آج کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے؟ اور لیا سمجھنے کے بعد سب سے پہلے اس کی ابتدا خود پاکستان سے کی جائے۔

یہ تھا وہ احساس جس کے ماتحت ہمارے محترم جناب پرویز نے آج سے ۱۶۔ ۱۷ سال پیشتر ایک ایسے قرآنی دائرۃ المعارف کی ترتیب کی بنیاد رکھی جس میں وہ سب کچھ موجود ہو جسے آپ قرآن سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ دراز کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی، جگر کاوی اور کوہ کنی کے بعد بتوفیق ایزدی اس